

Misali Seerate'n

مثالی سیرتیں

پرنٹ
شیل

مصنفہ

روفیسر علامہ سید علی محمد نقوی

پ

(ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مترجمہ

ادیبہ بنت زہر انقوی ندیٰ الہندی

نورہدایت زہر انقوی ندیٰ الہندی

ناشر

نورہدایت فاؤنڈیشن

حسینیہ غفران مآب[ؒ]، مولانا کلب حسین روڈ، چوک لکھنؤ-۳ (ہندوستان)

By

Professor Allama Sayed
Ali Muhammad Naqavi

Translated By

Binte Zahra Naqavi Nadal Hindi

Publisher

Noor-e-Hidayat Foundation
Imambara Ghufranmaab, Maulana Kalbe Husain Road,
Chowk, Lucknow-226003 (INDIA)
Website : www.noorehidayatfoundation.org



مثالی سیرتیں

مثالی سیرتیں	:	نام کتاب
پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی	:	مصنف
ادیبہ بنت زہر انقوی ندی الہندی	:	مترجمہ
نویرہدایت فاؤنڈیشن، لکھنؤ	:	ناشر
جائی کمپیوٹر پوائنٹ (08736009814)	:	کمپوزنگ
ایڈورٹائزرز انڈیا، گولڈن گنچ لکھنؤ	:	سرورق
کیم جنوری ۲۰۱۴ء	:	سنا اشاعت
ایک ہزار	:	تعداد
۱۰۰ اور روپے	:	ہدیہ

ملنے کے پتے

- ۱۔ امامیہ مشن، آرامگاہ سیدالعلماء، امامبازہ جنت آب، سیدالعلماء روڈ، اکبری گیٹ، لکھنؤ
 - ۲۔ نویرہدایت فاؤنڈیشن امام بارہ غفران آب، چوک، لکھنؤ (یو۔ پی۔)
- فون: 8736009814 — 9335996808
8736009814 — 0522-2252230
- ۳۔ امامیہ مشن، امامیہ ہال، نیشنل کالونی، امیرنشان علی گڑھ (یو۔ پی۔)

Website: www.noorehidayatfoundation.org

Email: noorehidayat@gmail.com

مصنفة

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی

(ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم پونیورسٹی علی گڑھ)

مترجمہ

ادیبہ بنت زہر انقوی ندی الہندی

ناشر

نویرہدایت فاؤنڈیشن

امامبازہ غفران آب، مولا ناکلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ۔ ۳ رانڈیا

فہرست

۵۱	پیغمبر، امام اور نوادغ میں فرق
۵۲	رسالت، امامت اور ولایت کا کردار
۵۲	معاشرہ کی رہبری
۵۳	اسلامی حقائق و معارف کا بیان اور تحفظ
۵۴	(ج) امامت کی باطنی رہنمائی
۵۵	کیوں ”امام“ یا ”ولی“ سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہنا چاہئے؟
۵۶	زمانہ غیبت میں ولایت امامت
۵۷	نقیلی لیلیں
۵۹	ولایت فقیہ کا فال
۶۱	حیاتِ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام
۶۱	-حضرت علی: ایک ہمہ جہت (Multidimensional) بहुمعنی (باہمی) / (باہمی) شخیصت
۶۳	-حضرت علی کے ادارے زندگی کی تقسیم
۶۴	پہلا دور علی پیغمبر کے ساتھ
۶۴	علی نے اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت حاصل کی
۶۷	دعوت ذاتی
۷۰	واقعہ ہجرت پر ایک تحقیق
۷۱	علی: پیغمبر کے معنوی بھائی
۷۲	سنه ہجری
۷۳	سنه ہجری کی جملکیاں
۷۴	سنه ہجری کے واقعات پر ایک نظر
۷۵	صلح حدیثیہ

۱۳	عرض نور
۱۴	سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جائسی
۱۵	سبحان اللہ
۱۶	میری سنو!
۱۹	پیش لفظ
۲۱	مصنف
۲۳	انبیاء کرام: انسان کامل کی نمونے
۲۶	(۱) پیغمبروں کی دو ہری حیثیت
۲۸	(۲) انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے
۲۹	حضرت محمد مصطفیٰ : ایک زندہ جاوید نمونہ عمل
۳۳	پیغمبر کی تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے
۳۴	حضرت فاطمہؓ کا سوہ جاوید
۳۹	جناب فاطمہ زہراؓ: اسلام میں عورت کے بلند مقام کا مظہر
۴۲	امامت و ولایت: ابعاد (Dimensions) اور مقابیم
۴۴	نبوت و امامت میں تعلق
۴۶	امامت اور ولایت کی ضرورت
۴۹	ائمہ علیہ السلام کی خصوصیتیں
۴۹	(۱) عصمت
۵۰	(۲) علم و ہبہ
۵۱	(۳) بشری پہلو

۹۹	تموار کے مقابلہ میں 'خون' کے حکمت ساز	۷۵	لے ہجری کے واقعات
۹۹	امام حسینؑ نے مقابلہ کیوں کیا؟	۷۶	۸۷ ہجری کے واقعات پر ایک نظر
۱۰۰	(الف) یزیدی	۷۸	۸۹ ہجری کے واقعات
۱۰۰	(ب) گروہ ناصحین و موافقین	۷۸	۹۰ ہجری پر ایک نظر
۱۰۰	(ج) عام لوگ	۷۸	غدیر
۱۰۱	ٹنکست میں فتح	۸۱	دور دوم: پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ کی زندگی
۱۰۱	حسینؑ اور حسینیوں کے کارناموں کا نتیجہ ٹنکست یافت؟	۸۳	امیر المؤمنینؑ کے سکوت کا سبب؟
۱۰۳	امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟	۸۳	علیؑ کے مخالفین بظاہر کا میاب کیوں؟
۱۰۳	تاریخ میں کربلا کا دوام	۸۶	تیسرا دور: دور خلافت
۱۰۴	ہانیل اور قابیل کی طاقتلوں میں تصادم	۸۸	علیؑ اور معاشرے کی تبدیلی
۱۰۵	حسینؑ، روانی تاریخ کے وارث	۸۹	علیؑ کو کون لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا؟
۱۱۰	یزید نے کیا کیا؟	۸۹	(۱) قاططین
۱۱۲	امام حسینؑ کے بعد کربلا کا تسلسل	۸۹	(۲) ناکشین
۱۱۲	انصار حسینؑ کی شجاعت	۸۹	(۳) مارقین
۱۱۵	کربلا میں پہلا شہید کون تھا؟	۹۱	امام حسن علیہ السلام
۱۱۶	ا۔ مسلم بن عوجہ اسدی	۹۱	شاہی اسلام سے امامت والے اسلام کے مقابلہ کے مظہر
۱۱۹	این عوجہ۔۔۔ زاہد بردا آزماء۔۔۔ پیر جواں ہمت	۹۱	امام حسنؑ: سامراج کے مقابلہ میں امامت کے علمبردار
۱۱۹	۲۔ بدال اللہ ابن عیمر کلبی	۹۳	امام حسنؑ نے صلح کیوں کی؟
۱۲۲	۳۔ عمر بن خالد	۹۶	امام حسنؑ نے اقتدار چھوڑ کے اسلام کیسے بچایا؟
۱۲۲	۴۔ سعد غلام عمر وابن خالد	۹۶	ظلم سے 'مظلومیت' اور 'تموار' سے 'خون' کا مقابلہ
۱۲۳	۵۔ مجعع ابن عبد اللہ	۹۹	امام حسن علیہ السلام، سید الشہداء

	مثالی سیرتیں
۱۲۶	۲۷- سلیم
۱۲۷	۲۸- سوارابن ابی عمرینہی
۱۲۷	۲۹- سیف ابن مالک عبدالدی
۱۲۷	۳۰- شیب ابن عبد اللہ
۱۲۷	۳۱- شیب (شیب) ابن عبد اللہ النہشلی
۱۲۷	۳۲- ضرغامہ ابن مالک تغلبی
۱۲۷	۳۳- عامر ابن مسلم عبدالدی بصری
۱۲۷	۳۴- عباد ابن مہاجر ابن ابی المهاجر جہنی
۱۲۷	۳۵- عبد الرحمن ابن عبد رب انصاری خزری
۱۲۸	۳۶- عبد الرحمن ابن عبد اللہ بن کدن ارجی
۱۲۸	۳۷- عبد الرحمن ابن مسعود
۱۲۸	۳۸- عبد اللہ ابن بشر خشمی
۱۲۸	۳۹- عبد اللہ ابن یزید ابن شبیط (شبیط) قیسی
۱۲۸	۴۰- عبد اللہ ابن یزید ابن شبیط (شبیط) قیسی
۱۲۸	۴۱- عقبہ ابن صلت جہنی
۱۲۸	۴۲- عمار ابن ابی سلامہ والالی (والالی)
۱۲۹	۴۳- عمار ابن حسان طائی
۱۲۹	۴۴- عمر وابن ضبیعہ بن قیس ابن ثعلبہ تیمی
۱۲۹	۴۵- عمران ابن کعب ابن حارث اشجعی
۱۲۹	۴۶- قارب غلام حسین
۱۲۹	۴۷- قاسط ابن زہیر ابن حارث تغلبی

۱۲۳	۶- عائد (عائذ) بن مجمع
۱۲۳	۷- جنادہ ابن حارث سلمانی
۱۲۳	۸- جنرب ابن حجیر کندی خولانی
۱۲۳	۹- دهم ابن امیة عبدالدی بصری
۱۲۴	۱۰- امیة ابن سعد امن زید طائی
۱۲۴	۱۱- جابر ابن حجاج
۱۲۴	۱۲- جبلہ بن علی شیبانی
۱۲۴	۱۳- جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزری
۱۲۴	۱۴- جون (جوین) این مالک این قیس بن ثعلبہ تیمی
۱۲۵	۱۵- حارث این امراء اقیس این عالم کندی
۱۲۵	۱۶- حارث بن نہمان (نہمان)
۱۲۵	۱۷- حباب ابن حارث
۱۲۵	۱۸- حباب ابن عامر این کعب تیمی
۱۲۵	۱۹- جشه بن قیس آنی
۱۲۵	۲۰- حجاج ابن زید سعدی تیمی
۱۲۶	۲۱- حلاس بن عمرو ازادی راہی
۱۲۶	۲۲- حنظله این عمر (عمرو) شیبانی
۱۲۶	۲۳- زاہر بن عمرو اسلی کندی
۱۲۶	۲۴- زہیر ابن بشر خشمی
۱۲۶	۲۵- زہیر ابن سلیم این عمرو ازادی
۱۲۶	۲۶- سالم غلام عمار این مسلم العبدی

۱۰	مثالی سیرتیں
۱۳۸	۲۸۔ نافع بن ہلال جملی
۱۳۸	۲۹۔ بریر ابن خفیر ہمدانی
۱۳۸	۳۰۔ ابوثمامہ صائدی
۱۳۸	۳۱۔ جون غلام ابوذر غفاری
۱۳۰	۳۲۔ شہداء بنی ہاشم
۱۳۱	۳۳۔ بنی ہاشم کا پہلا شہید
۱۳۲	۳۴۔ اولاً امام حسینؑ
۱۳۲	۳۵۔ اولاً امام حسنؑ
۱۳۲	۳۶۔ اولاً امیر المؤمنینؑ
۱۳۳	۳۷۔ اولاً جعفرؑ
۱۳۳	۳۸۔ اولاً عقیلؑ
۱۳۳	۳۹۔ زینب سلام اللہ علیہا
۱۳۳	۴۰۔ شہادت کی پیغامبر اور انقلاب کے تسلسل کی نشانی
۱۳۵	۴۱۔ حضرت زینب کی شجاعت
۱۳۶	۴۲۔ جناب زینبؓ کی اہم ذمہ داری
۱۳۸	۴۳۔ امام زین العابدین علیہ السلام
۱۳۸	۴۴۔ تحریک کر بلاؤ جاری رکھنے والے
۱۵۱	۴۵۔ صحیفہ ہجادیہ کی دعاویں کا تجزیہ
۱۵۶	۴۶۔ امام کے عرفانی پہلو اور علمی بلندی
۱۵۹	۴۷۔ امام محمد باقر علیہ السلام
۱۵۹	۴۸۔ فکری انقلاب کے علمبردار

۹	مثالی سیرتیں
۱۲۹	۴۹۔ قاسم ابن عجیب ابن ابی بشر ازدی
۱۲۹	۵۰۔ کردوس ابن زہیر ابن حارث تغلبی
۱۲۹	۵۱۔ کنانہ ابن عقیل تغلبی
۱۳۰	۵۲۔ مجح ابن زیاد ابن عمر و جہنی
۱۳۰	۵۳۔ مسعود ابن حجاج تیمی
۱۳۰	۵۴۔ مسلم بن کثیر اعرج
۱۳۰	۵۵۔ مقتطع ابن زہیر ابن حارث تغلبی
۱۳۰	۵۶۔ منج بن زیاد
۱۳۰	۵۷۔ نصر ابن ابی نیزر
۱۳۰	۵۸۔ نعمان بن عمرو واژدی راسی
۱۳۱	۵۹۔ نعیم ابن عجلان انصاری
۱۳۱	۶۰۔ کبر بن حبیب بن ثعلبة تیمی
۱۳۱	۶۱۔ عمر ابن جنادہ بن کعب خزری
۱۳۱	۶۲۔ یزید ابن حصین مشرقی
۱۳۲	۶۳۔ حبیب ابن مظہر اسدی
۱۳۲	۶۴۔ حرابن یزید ریاحی
۱۳۵	۶۵۔ حراکاولیر اناختخاب
۱۳۷	۶۶۔ سعید ابن عبد اللہ خفی
۱۳۷	۶۷۔ زہیر ابن قین ابی قیس الجبلی
۱۳۷	۶۸۔ سلمان بن مضارب بن قیس الجبلی
۱۳۸	۶۹۔ عمر وابن قرۃظہر بن کعب الانصاری

۱۵۹	امام محمد باقر اور اشاعت دین
۱۶۱	امام محمد باقر کے زمانے کے حالات
۱۶۳	گھنٹن کے دور میں امام کی حکمت عملی
۱۶۵	نبیتاً آزادی کے دور میں امام کی حکمت عملی
۱۶۸	امام جعفر صادق علیہ السلام
۱۶۸	”بیغام“ کو ”نظام“ میں ڈھالنے والے
۱۷۳	امام جعفر صادق کے عظیم کارنامے
۱۷۹	امام موسی بن جعفر علیہ السلام
۱۷۹	ظل و جور سے معزکر کے علمبردار
۱۸۰	امام موسی بن جعفر کی زندگی اور مفہوم وابعاد امامت
۱۸۱	امام کا وہی علم
۱۸۲	امام کی سیاسی رہبری
۱۸۳	امام کی علمی و فکری رہبری
۱۸۵	امام کی روحانی منزلت
۱۸۷	امام رضا علیہ السلام
۱۸۷	مامون کی سیاست کا تجربیہ — امام رضا اور ان کا طریقہ کار
۱۸۷	مامون کی چال
۱۹۰	مامون کا مقصد
۱۹۰	”طاقت“ کو اقتدار میں اور ”فرمان“ کو ”شرع“ میں بدلنا
۱۹۱	دوسرامقصد — عوام کی نظر میں حکومت کی سماحت کو بدلنا
۱۹۲	تیسرا مقصد — ابھرتی ہوئی شیعہ تحریک کو دبانا

۱۹۳	چوتھا مقصد — امام کی شخصیت کو توڑنا
۱۹۴	پانچواں مقصد
۱۹۴	داخلی دشمنوں کے خلاف اقتدار کی جنگ میں شیعہ طاقت کا استعمال
۱۹۴	چھٹا مقصد — خراسان کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنا
۱۹۵	شہادت امام رضا — مامون کی اسٹریٹجی کی ناکامی
۱۹۵	امام رضا کی حکمت عملی
۲۰۰	امام محمد تقی علیہ السلام
۲۰۰	تاجدارِ تقویٰ
۲۰۰	ایک شبہ کا جواب
۲۰۱	اُس زمانے کے سیاسی حالات
۲۰۲	امام جواد کے مقابلے میں مامون کی تکونی چال
۲۰۶	امام علی نقی علیہ السلام
۲۰۶	متوکل سے مقابلہ کے سورما
۲۱۰	حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام
۲۱۰	کی حیات اور ان کے کارہائے نمایاں پر ایک نظر
۲۱۰	زمانہ امام کے سیاسی حالات
۲۱۲	اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں امام کا کردار
۲۱۳	امام کے بعض مشہور تلامذہ
۲۱۶	امام زمانہ جل اللہ فرجہ الشریف
۲۱۶	امام زمانہ اور عقیدہ مہدویت
۲۱۷	غیبت کے دور میں امام کون سا کردار ادا کر رہے ہیں؟

۲۱۸

۲۲۱

فلسفہ غیبت

تاریخ ترجمہ 'اسوہ ہائے جاوید'

بسمہ سبحانہ

عرض نور

الحمد لله الذي هدانا للهذا او ما كنا نهتدى لو لا ان هدانا الله.

اس ایک پالنے والے کی حمد و شناجس نے انسان کو احسن تقویم بنایا اور عقل و تمیز سے نواز کر اسے ارادہ واختیار کی (ایک حد تک) آزادی عطا کی پھر یونہی چھوڑنیں دیا، نور ہدایت سے راستہ بھی دکھا دیا، وہ بھی بسر و علن، ظاہر و باطن سے، ملفوظی و مکتبی طور سے اور اول سے آخر تک۔ اس کا شکر کیسے ادا کر سکتے جس نے رہو سے پہلے رہنمای خلق کیا اور رہنمائی کے سلسلہ کو باقی بھی رکھا۔ اس سلسلہ ہدایت کو شاہ کار تخلیق فخر موجودات ہستیوں تک پہنچایا اور انہیں کو ہمارے لئے فکر و عمل کا نمونہ قرار دیا۔ ان مثالی شخصیتوں کے کردار کو ہمارے دل و دماغ، فکر و نظر اور زبان و قلم اپنے اپنے انداز میں خرچ عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں سمجھنے اور (دنیا کو) سمجھانے کی سعی کرتے آئے ہیں۔ اس تسلسل میں نور ہدایت فاؤنڈیشن، بھی انوار معصومین، منظر عام پرلانے کے بعد اپنی پیش کش کے طور پر اب مثالی سیرتیں، پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یہ کتاب دراصل پروفیسر (ڈاکٹر مولانا) سید علی محمد صاحب نقوی دام عزہ کی ایک علمی تحقیقی تجزیاتی کاوش کا اردو ترجمہ ہے جو مترمہ سیدہ بنت زہراندی الہندی کی قلمی سعی کا نتیجہ ہے۔

اسید ہے ہمارے محترم باذوق قارئین اس کی خاطر خواہ پذیرائی فرمائیں گے جو ہماری حوصلہ افزائی کا سبب ہوگی۔

خاک پائے در آل نبی

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جائی

نور ہدایت فاؤنڈیشن

لکھنؤ

موباکل: 8736009814



بسمہ سبحانہ

سبحان اللہ

قلم آج ان کی جیبے بول

اندھا چکا چوندھ کا مارا کیا جانے اتھاس بیچارہ
سماشی ان کی مہما کے ہیں سوریہ چندر بھوگول کھگول
قلم آج ان کی جیبے بول

قلم آج اٹھا ان کا نشاں کہ گونجے زندہ باد سے جہاں
اندھی چکا چوندھ کی ماری کیا جانے تاریخ بیچاری
شاہد ان کی عظمت کے ہیں سورج چاند زمیں آسمان
قلم آج اٹھا ان کا نشاں کہ گونجے زندہ باد سے جہاں
ہندی کے شاعر کو بڑے دور کی سمجھی۔ تاریخ انسانی کے بڑے بنیادی راز کا درک کر لیا۔

ظاہر ہے، سامراج کے بنوائی تڑک بھڑک اور بنوٹ کی چکا چوندھ میں اندھیر ماری بندھوا، تاریخ ان عظمتوں کی کہکشاں کو دیکھنے کی اقبالی مجرم، کہاں ہو سکتی جو تاریخ کے فوکس میں آنے کی بنیادی الہیت سے بھی عاری ہوں؟ ان میں نہ تخت کی ہنک ہو، نہ محل کی مہنک ہو، نہ دربار کی بھنک ہو اور نہ ہی بغافت و شورش کی دھمک۔ اپنی اس قطعی پیدائشی روٹ کے باوجود تاریخ چاہے انجاہے، ایک سلسلہ کردار سے (جو موجودہ تالیف کا موضوع ہے) صرف نظر نہ کر سکی۔ اس پر طرہ یہ کہ تاریخ کے آقا، اس سلسلہ کے کرداروں سے، نہ جانے کیوں، بہ سرو عن مخاصمانہ و معاندانہ مخالفت پالے رہے۔ یعنی اپنے بھرتاریخ کا فوکس ان کی مخالف سمت ہی چاہتے رہے ہوں گے۔ (یہی نہیں حدود کو پا کرتی ہوئی مخالفت ان کے اجلے دامن کردار پر کسی میل کا کوئی ہلاکا سا چھینٹا کہنے کو بھی نہ لگا سکی۔) یہ سب کیا تھا؟ کوئی سچ تھا جو سرچڑھ کر بولتا رہا، یا اس سلسلہ کے غیر معمولی کمالات کی

بلا خیز تابانی تھی جو آنکھوں دکھاتے سامراج اور انہی اپاچ (کی گئی) تاریخی آنکھوں میں سماں رہی، یا کوئی قدرتی فطری انتظام تھا جو تاریخی روٹ کو دھندا دکھاتا رہا یا پھر کوئی روحانی اعجازی عصا تھا جو تاریخ اور سامراج کے سامنے سانپوں کو نگتار رہا۔

بارہ تیرہ ہستیوں کی چودہ ہستیوں کا یہ سلسلہ کوئی تین صدیوں پر محیط اور مسلسل جلوہ فزارہا، پھر بھی اس میں کردار کی پوری پیاسانیت، یا گنجت اور یک رنگی ہی نہیں وحدت کردار نمایاں رہی۔ یہ وحدت کردار کمال و معراج انسانیت کو سمیئے ایک اصول و ضابطہ کی جامع جو لالا گاہ، ایک فکر و نظر (نظریہ یا عقیدہ کہہ لیجئے) کی بھرپور ٹپکل (Typical) کارگاہ بنی رہی۔ دوسرے لفظوں میں یہ وحدت اصول عمل، ضابط و اقدام کا ہم آہنگ نکتہ اتحاد ثابت ہوتی۔

اس اصولی سلسلہ کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی ’تاریخیت‘ بھی ہے۔ دنیا کے سماجی اخلاقی نظریات اپنے نمونہ عمل دینے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ادھرا کثر و بیشتر (اور قریب قریب بھی بڑے) مذاہب کے دینی ’نمونے‘ تاریخی اور انسانی کردار سے عاری ملتے ہیں۔ مہاتما بدھ، شری کرشن، چناب موئی اور حضرت عیسیٰ تھج جیسے مذہبی سربراہوں، بانیان مذاہب کی ہستیاں ضرور تاریخی ہیں لیکن ان کی حیات، کردار، شخصیتیں ماورائے تاریخی رہیں۔ لیکن مذکورہ سلسلہ کی جتنی بھی ہستیاں ہیں، وہ سارے ناسازگار ماحول کے باوجودہ صرف تاریخ کا جزو بن کر رہیں بلکہ ماورائے عقل، اساطیری (Mythological) دنیا کے ہوائی پیکر یا ’ہوا‘ بھی نہ بننے پا سکیں۔ یہ الگ بات ہے، تاریخی ستم ظریفی کہہ لیجئے یا تاریخ انسانیت کی بدختی کہ ان کی جزوی عکاسی کے سواتمام و کمال عکس بندی تاریخ کو نصیب نہ ہو سکی، لیکن اسی جزوی عکس بندی کی معقول توسعی تعبیر (Extrapolation) سے ایک حد تک مکمل تصویر ابھارنا مجاہل نہیں ہے۔

اس سلسلہ کی کسی ہستی یا مختلف ہستیوں کے بظاہر مختلف روئے ضرور دیکھے یا سمجھے جاسکتے ہیں لیکن وہ وحدت کردار پر کوئی سوالیہ نشان نہیں بن سکتے۔ مجموعی طور سے اس سلسلہ پر کچھ غاراً نہ نظر سے ہی یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ یہ بظاہر مختلف روئے اختلاف کردار کا آئینہ نہیں بلکہ مختلف

حالات اور مختلف ماحول سے معاملات (Interactions) کا نتیجہ ہیں جن کے پیچھے ایک ہی اصول و قاعدہ، عدل و اعتدال کا فرمارہا۔

یہ سلسلہ کروار بامقی جامعیت، پراش جاذبیت اور پر جہات املاگیت (Communicativity) سے بھی خاص ہے اور اتنا کہ مختلف ذہنوں نے اس کی بے ساختہ مجد و بانہ جب سائی کی۔ مختلف ذہنیتوں نے اسے اپنے اپنے انداز میں پڑھا، سمجھا اور سمجھایا، اور اس میں اپنے اپنے نکتہ نظر کی تسلیکین کا سامان پایا۔ اس سلسلہ میں مذہب نے اپنا قائد و امام دیکھا، دانشوری کو مسیح املا، فلسفہ و حکمت کو پناہ ملی، منطق کو اسی میں بول ملا، روحانیت و تصوف نے اس میں اپنا منہما تلاش کیا۔ اخلاق کو یہاں معراج انسانیت دکھی۔ راہِ عشق نے یہیں منزلِ مودت پائی۔ خودی کی بلندی نے یہاں رضا پائی۔ یہاں آکر عقل کی بن آئی (نہیں تو احمقوں کی جنت میں عقل کو کون پوچھے؟) اسی سلسلہ کے زیر سایہ فلسفہ نے سائنس کی طرف انقلابی جست لگائی۔

اس سلسلہ کو سمجھنے سمجھانے کے ضمن میں حالیہ برسوں میں ایک قابلِ قدر نگارش 'اسوہ بائی جاوید'، نگرش تحلیلی پیرامون 'سیرہ ائمہ' منے آئی ہے۔ فارسی زبان کی یہ نگارش اصلاً عقائد کے مقدس ٹیلیسکوپ سے اس سلسلہ کو دیکھنے کی ایک فاضلانہ تحقیقی و تجزیاتی کاوش ہے۔ نامور عالم و دانشور، محقق و فاضل، معلم و مصنف پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید علی محمد نقوی کا قلمی شاہکار انتشارات واحد، فربنگی بنیاد شہید انقلاب اسلامی، ایران، کی ۱۳۲۲ ھجری (۱۹۸۳ء) کی اشاعت ہے۔ فضل مولف کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ لکھنؤ کے شہر، آفاق علمی خانوادہ خاندان اجتہاد سے تعلق رکھنے والے اور دور حاضر کی نابغہ روزگار ہشت پہلو ہستی، سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب رہا کے چشم چراغ ہی نہیں ان کی علمی، تعلیمی، تحقیقی و قلمی مند کے رونق افروز جانشین (باحسن و جوہ خلاف صالح) ہیں۔ اپنی نسبتی خصوصیات کے ساتھ بذات خود انفرادیت کی چھاپ چھوڑ چکے ہیں اور یگانہ و بیگانہ کے مదوح ہو چکے ہیں۔ اسلامی عمرانیات (Islamic Sociology) اور اسلامی عرفانیات و تصوف کے اس اختصاصی فاضل کی فارسی اور انگریزی کی قلمی مساعی دنیا کے

کمال سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مذکورہ فارسی نگارش کی اردو جامہ زمینی ادیبہ و فاضلہ، عزیزہ معززہ، خطیبہ و معلمہ سیدہ بنت زہرانقویہ زندگی الہندی کی سمجھی مشکور ہے۔ (پرہد دار) فاضلہ مترجمہ کی ادبی شخصیت بہر صورت مستور نہیں، جلوہ مقدور ہے۔ عصری اردو جرائد میں شائع ہونے والی موصوفہ کی شعری و نثری تخلیقات اپنی زبان میں کہتی ہیں۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ترجمہ کا ہم جو یانہ حوصلہ لاائق داد ہے۔ ترجمہ خود اپنے میں نازک ترین صنف ہوتا ہے جہاں نہ جانے کتنی ہی تخلیقی و تیں شہید نہ از ہو جایا کرتی ہیں۔ پھر ترجمہ کا یہ نازک نیں خون، فلم صنف نازک کے ہاتھ جو لوگ جائے تو کمال آزمہ نہدی کیا رنگ دھکلائے اور خانہ بر انداز چمن، کس کس طرف اور کیا کیا ملک و ثمر پھینکنے!! کچھ بھی ہو، کسی ملک و ثمر میں کسی ترجمہ نگار کو اپنے لئے اقتض قدر تحسین کچھ نہ دیکھنا چاہئے۔ اسے تو نہ ستائش کی تمنا، نہ صدہ کی پروا، کا واقعی بے نیاز پیکر ہونا چاہئے کیونکہ اسے کھوکھی قدر داری کے سوا کچھ نصیب ہوئی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ زبان یار مکن ترکی و من ترکی دا مُم و ای ناواقفیت کے شوق تحسس سے کچھ ہمت افزائی مل جائے تو بہت ہے۔ ترجمہ کا قاری الباس مجاز ہی کو سجدہ کر لیتا ہے اور الباس مجاز میں آنا حقیقت کی شان نہیں۔ جس کی پہنچ جلوہ حقیقت کے طور تک ہوتی ہے، وہ اسی کی برق تجھی سے غش کھا جاتا ہے، ترجمہ کے مجاز کو کیوں اور کیسے دیکھنے لگا۔ ترجمہ تو حقیقت کی لا حاصل ترجمانی کے چکر میں مجاز کے اصلی، حسن سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ پھر بھی مترجمہ موصوفہ کو دل تھوڑا نہ کرنا چاہئے کیونکہ بخت رسائے انہیں ہمسفر حیات کی صورت میں لطیف و نظریف ہم صیر ایسا ملا ہے جو مذکورہ ترجمہ کے حوالہ سے 'طور سا' بھی ہے اور 'مجاز آشنا' بھی، یعنی ترجمہ کے لئے حرف تحسین تخلیق کرنے کی بنیادی الہیت رکھتا ہے۔ امید قوی ہے کہ وہ اپنے عالیٰ فرائض کے ساتھ اس استحباب کو بھی (کم از کم پاس خاطر اہمیت) بحد الہیت اپنی فطری ظریفانہ خوش اسلوبی سے ادا بھی کر دیں گے۔ فقط والسلام
فضول کی اپنی اس باصرہ خراشی کے لئے شرمندگی اور معافی کا پیکر۔

میری سنو!

میرے شوہر مولانا سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جائی کا مجھ سے اصرار رہا کہ میں علامہ سید علی محمد نقوی کی مشہور کتاب ”اسوہ ہائے جاوید“ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروں۔ پچھلے دنوں تک تو ہمت نہ پڑی لیکن آخر کار ہمسر، ہمسفر بلکہ شریک حیات کے قول ساتھ ہی موصوف کے علامہ نقوی سے قول و قرار کا احترام کرتے ہوئے قلم کواٹھنا ہی پڑا۔ اس تحریری سفر میں جن مشکلات کا سامنا پڑاں ہیں لکھنا صرف اور صرف اطناں کو شدیدنا اور حسن ایجاد کو مجرور کرنا ہوگا۔ البتہ یہ لکھنا جذبہ احسان شناسی کے تحت اوجب ہے کہ اگر میرے شوہر اور سب سے اہم (محقق گرامی ادیب العصر) م۔ ر۔ عابد کے حق نما، حقیقت نگار اور حقائق نگار اقسام صحیح کا کام نہ انجیام دیتے تو یقیناً یہ ترجمہ منظر عام پر نہ آتا اور اسی لئے آج نہیں بلکہ میرے لئے ہمیشہ ہی یہ افراد اپنے بھی تعاون و مشورت یعنی سعیِ جمیل کے سبب مشکور ہیں گے۔

ترجمہ نگاری میں میں کہاں تک کامیاب ہوئی اس کافیلہ اہل نقد و نظر کریں گے البتہ معصومین علیہم السلام کی سوانح کو اردو میں پیش کر کے میں کافی مسرو و مطمین ہوں کہ کچھ اپنی محنت کے سبب ثواب وہاں کے لئے ذخیرہ کرچکی ہوں اور اب کچھ نہ کچھ قاریان کتاب کی قراءت کے سبب مزید مشاہب ہو جاؤں گی۔

اصل کتاب کی معنوی و ادبی عظمت سے میں خود بخوبی آگاہ نہیں ہوں ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اگر مصنف موصوف اس کتاب کو اردو میں لکھتے تو یہ کتاب بھی آیۃ اللہ العظیمی سید العلاماء سید علی نقی نقوی رحمہ اللہ کی لاثانی کتابوں یعنی ”رہنمایان اسلام“ اور ”معراج انسانیت“ کی طرح امتیازی شان کی ہوتی جس کا ترجمہ سے بھی کافی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو زبان میں سید العلاماء کی مذکورہ کتاب میں اپنی مثال آپ ہیں کاش یہ کتاب بھی کسی حد

تک اصل کتاب کے ترجمہ ہی کی حیثیت سے ابلاغ و ترسیل کا کام انجام دیکر سید العلاماء کی دونوں کتابوں اور علامہ موصوف کی اصل کتاب کے ساتھ میں مفید ثابت ہو سکے۔

علامہ سید علی محمد نقوی کی ایک کتاب ”پانچ کرنیں“ اردو میں ہے جو آپ نے اٹھاڑہ سال کی عمر میں لکھی ہے۔ خمسہ بجا یعنی پنجتین پاک کا تذکرہ ہے، جوزبان و بیان، معافی و مطالب اور تفہیم و تبلیغ کے اعتبار سے بڑی کامیاب کتاب ہے اور حسن سے موصوف کی بلندی فکر اور علوی علم کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی عہد طالب علمی کے بہت سے معمرکہ الارامقا لے ہندوستانی موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے جنہیں بعد میں ماہنامہ ”شعاع عمل“ میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع کیا تھا۔ مذکورہ عہد ہی میں موصوف کے مذہب و ادب کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی ابتدائی، بنیادی، کتاب پچھے شائع ہوئے ہیں جو ان علوم کی تسهیل کے لئے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

علامہ موصوف کے دوسرے تصنیفات فارسی، انگریزی اور دیگر اہم زبانوں میں شائع ہو کر ایران، ہندوستان اور دیگر ممالک میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

قرآن شناسی کے تحت بالکل نئے انداز کے انگریزی اور اردو زبانوں میں ترجمہ و تفسیر کا سلسہ جاری ہے جس کی دو جلدیں انگریزی میں چھپ چکی ہیں جسے مع مقدمہ تفسیر اکٹیں جلدیں میں منتظر عام پر آنا ہے۔ خیر اپنا یہ تحریری کام قارئین کے سامنے ہے جسے میں اپنے لئے ذخیرہ آخرت سمجھتی ہوں۔ میں ممنون و متشکر ہوں مصنف علام، م۔ ر۔ عابد صاحب، اپنے شوہر عالیقدر نیز کارکنان نور ہدایت فاؤنڈیشن جن کی علمی و عملی مدد کے سبب یہ کتاب زیور طباعت سے آرستہ ہو رہی ہے۔

فقط و السلام

بنت زہر نقوی ندیٰ الہندی

حسین آباد، لکھنؤ

۳۰ مارچ ۲۰۱۸ء

پیش لفظ

اسلام دوسرے مذاہب کے برخلاف صرف مذہبی رسومات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انسان کی دنیاوی اور مذہبی کامیابی کا جامع نظام ہے اور انسان کی معنوی، روحانی، اخلاقی اور سماجی کامیابی کے طریقہ بتلاتا ہے۔ اسلام صرف Theory نہیں پیش کرتا جو صرف کتاب خانوں اور فلسفیوں کے کام آئے بلکہ علمی نمونے اور زندہ سیرتیں سامنے لاتا ہے تاکہ وہ اپنے کروار اور گفتار سے اسلام کو پیش کریں۔

جناب پیغمبر خدا اسلامی تعلیمات کی زندہ مثال اور نمونہ تھے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ پیغمبر کے لئے ممکن نہ تھا کہ اپنی زندگی میں ان تمام حالات کا سامنا کرنے کا طریقہ بتائیں جو آئندہ صدیوں میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔ لہذا یہ بے حد ضروری اور اہم تھا وسری زندہ سیرتیں موجود ہوں جو مختلف حالات و شرائط سے دوچار ہوں اور عملاً مسلمانوں کو یہ بتا لیں مسلمانوں اور مونین کو ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔

اسی لئے ہمارا ہر امام ایک خاص ماحول میں رہا۔ کسی نے صلح کی، کسی نے جنگ کی، کسی نے معارف اسلامی کی عظیم یونیورسٹی قائم کی، کسی نے دعا کے ذریعے اپنے مشن کو آگے بڑھایا، کسی کو تخت سلطنت پیش کیا گیا اور کسی کی ساری عمر قید خانے میں بسر ہوئی۔ اسلام نے خواتین کے لئے بھی زندہ سیرتیں پیش کی ہیں۔

ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم حالات کے تقاضے اور امام معصوم کے کردار کو صحیح کرے بغیر ہم شیعہ کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔ یہ بہت اہم ہے کہ ہم یہ جانیں کہ کتنے حالات میں امام نے کس حکمت عملی کو اپنایا۔ ائمہ معصومین کی سیرت کا مطالعہ صرف شیعوں کے لئے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے۔ کیونکہ ائمہ کی جدوجہد اور کوشش و جہاد

اسلامی بنیادوں کے تحفظ کے لئے تھی۔

علمی سطح پر اسلامی وحدت کے قائم ہونے کے لئے ضروری ہے اسلام کے مختلف فرقے ایک دوسرے کی تاریخ سے واقف ہوں تاکہ نفرت اور بدگمانی کی فضا ختم ہو سکے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جو واقعات رونما ہوئے اور وہ مقاصد جن کے لئے شیعوں نے دجلہ اور فرات کو اپنے خون سے نگین کیا، وہ کسی خاص فرقے سے متعلق نہیں تھے بلکہ یہ ٹکراؤ دربار سلطنت اور محمد علیؑ کے ماننے والوں کے مابین ٹکراؤ تھا۔

پہلے کچھ برسوں سے پوری دنیا میں ہمارے ائمہؑ کی سیرت کے مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن یہ لوگ جو کچھ جانتے ہیں وہ سب غیر شیعی آغاڑ سے ہے اور ظاہر ہے کہ نادرست واقعات اور تجزیہ و تحلیل سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف ان لوگوں کی تحقیقات ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت ہوتی ہیں اور زیادہ تر استعماری طاقت کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لہذا لازم ہے کہ اپنے محققین اس سلسلے میں بحث و مباحثہ کریں اور کتابیں لکھیں۔ لیکن چند محدود کتابوں کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر امامؑ کے حالات زندگی پر مبنی ہے، نہ کہ ان کے کردار و سیرت کی تفسیری و تحلیلی جائزہ پر۔ اس کتاب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ واقعات کے بیان سے پرہیز کریں اور صرف واقعات کا تجزیہ و تحلیل پیش کریں۔ یہ ابتدائی قدم ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ہمارے بڑے محققین اپنی محنت کو کتابی شکل میں پیش کریں گے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ائمہؑ کی سیرت ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک فکر بشری نہیں پہنچ سکتی اور یہ موقع نہیں کرنی چاہئے کہ چند صفحے میں امامؑ کی سیرت اور کردار کو پیش کیا جاستا ہے۔

والی اللہ التفویض و علیہ التکلان

علی محمد نقوی

۱۳ رب جادی الثاني ۱۴۰۳ھ
مطابق ۸ فروردین ۱۴۰۲ھ

انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے

جس طرح انسان اپنے مادی وجود کو باقی رکھنے کے لئے غذا اور آب و ہوا کا محتاج ہے اور بھوک، پیاس اور دوسرا بینایدی ضرورتوں کی تکمیل کے بغیر اپنے مادی وجود کا تحفظ نہیں کر سکتا ہے، بعینہ اسی طرح اپنے روحانی اور انسانی وجود کو جاری رکھنے کے لئے، کمال کی جتنجو، تلاش حق، مبداؤ معاد سے آگاہی اور شریعت و قانون جیسے فطری خواہشات کی تکمیل کی بھی ضرورت ہے۔

جتنجوے حقیقت کی انسانی پیاس، کمال کی چاہ نیز کائنات کے معنی و مفہوم، سست اور مقصد کو جانے کی انسانی خواہش، کسی بھی طرح اس کی پانی اور غذا کی ضرورت سے مکتنہیں ہے۔

اگر ایک کافidan انسان کی مادی موت کا باعث ہے تو دوسرے کافidan اس کی معنوی اور روحانی موت کا سبب ہے۔ اول الذکر میں کمی ہونے سے انسان بھوک مری اور جسمانی اذیتوں کا شکار ہوتا ہے جبکہ موخر الذکر کی کمی اسے دہشت، ذہنی دباؤ، ذہنی کرب اور روحانی اور نفسیاتی کھلبی میں مبتلا کرتی ہے۔ کمال خواہی اور حقیقت کی پرستش کے اپنے رحمانات کی وجہ سے انسان اپنے مادی وجود کو قربانی کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

دنیا میں الہی سنتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جب مشیت خداوندی انسان کے اندر کسی ضرورت یا طلب کی تخلیق کرتی ہے تو ساتھ ہی اس کی تکمیل کے ذرائع بھی فراہم کرتی ہے۔ انسانی فطرت میں کوئی طلب ایسی نہیں ہے جسے پورا کرنے کا خالق عظیم و برتر نے کوئی انتظام نہ فرمایا ہو۔ مثال کے طور پر اگر انسان کو بھوک اور پیاس کا احساس ہوتا ہے تو قدرت نے دو طرح کے وسیلے انسان کے حوالے کئے ہیں، ایک حصہ بدن کے اندر ہے جیسے دانت، زبان، ہاضمہ اور دوسرا حصہ بیرونی وسائل جیسے اناج کی پیداوار کے لئے سورج، ہوا، زمین اور دانہ۔

چنانچہ جہاں اس نے مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بعض وسائل کو انسان کے

اندر اور بعض کو باہر سے فراہم کیا ہے۔ اسی طرح معنوی اور انسانی تقاضوں جو کہ کمال طلب فطرت اور حقیقت طبی، مبداؤ معاد، مقصد و جود اور نظام کائنات سے آگاہی کی انسانی ضرورت سے پیدا ہوتے ہیں، کے تکمیل کے لئے بعض عوامل کو اندر اور بعض کو باہر سے فراہم کیا ہے۔

اندر وی وسائل میں فکر و اندیشہ کی صلاحیت، خمیر اور مکاشفہ ہے اور بیرونی وسائل میں انبیاء کی بعثت اور نزول وحی ہے۔^(۱) نبوت کی ضرورت خوارک، پانی اور ہوا کی ضرورت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ جس طرح بھوک اور پیاس جسمی مادی تقاضوں کی تکمیل کے لئے محض داخلی معاد نہیں ہی کافی نہیں اور یہ اس وقت تک ناقص ہیں جب تک ان میں بیرونی معادوں کی شمولیت نہ ہو۔ اسی طرح انسانی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل، نبوت و رسالت جیسے الہی عہدوں سے مدد لئے بغیر نہیں ہو سکتی ہے اور انسان صرف اپنے اندر وی صلاحیتوں پر بھروسہ کر کے دنیوی اور اخروی سعادت کو حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

جس طرح کہیں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے اور ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے تو بادل فطری طور پر وہاں پہنچتے ہیں اور باران رحمت، کھنقوں اور پہاڑوں کو سیراب کرتا ہے، بالکل اسی طرح جب کوئی قوم حق و صداقت کی راہ سے بھٹک جاتی ہے اور کمال جوئی کے راستے سے دور ہو جاتی ہے، مبداؤ و معاد کا تصور اور کائنات کے مقصد و معنی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے معنوی اور فکری افق سیاہ و تاریک ہو جاتی ہے اور حقیقت باطل کے پرتوں میں چلی جاتی ہے، اس وقت سنت الہیہ کے مطابق اور مشیت خداوندی کے حکم سے ایک پیغمبر مبعوث ہوتا ہے جو خاص صلاحیتوں سے بہرہ و راہ و بندوں کے لئے پیغام الہی کا حامل ہوتا ہے اور پھر کاروان بشریت کو صحیح راستے اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

متکلمین اور فلاسفہ اسلام کی اصطلاح میں ”نبوت“، ”در اصل اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت عامہ کا نام ہے جوستی و کائنات میں جاری و ساری ہے۔ چونکہ ذات خداوندی ”واجب الوجود بالذات“

(۱) (جمع لجر، لکھ، ”عقل“)

اور ”ہر جہت سے واجب الوجود“ ہے، لہذا وہ صحیح معنوں میں فیاض علی الاطلاق ہے۔ تمام موجودات اور اشیاء، جہاں تک ان کے لئے لازم ہے، کرم و عنایت کرتا ہے اور ان کو ان کے کمال کے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔^(۱) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: {قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى} (ط: ۵۰)

”خداۓ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اپنی تمام مخلوق پر جو اس کی حلقہ گوش تھیں اس نے عنایت کی اور اپنی بتائی ہوئی راہ کی ہدایت کی“۔ نبوت اور رسالت اس خدائی ہدایت کے سلسلے کی سب سے کامل اور اعلیٰ کڑی ہے۔ انسان کو ایسی ہدایت کی ضرورت ہے جو روزمرہ کی مبتدل زندگی سے ماوراء افق تک اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس کے علاوہ وہ دنیوی زندگی کی تنظیم کے لئے ایک مکمل اور جامع نظریہ اور نظام کا بھی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ اصل تفضل و عنایت کی بنیاد پر اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اس کی پیاس کو بجاۓ بغیر چھوڑ سکتا ہے۔

قانون اور طرز حیات کی انسانی ضرورت بھی جوانسانی سماج کی سعادت کی ضمانت ہے، بغیر یہ وہی امداد کے پوری نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ قانون کو اس طرح ہونا چاہئے کہ انسانی وجود کے تمام زادیوں اور پہلوؤں پر نظر رکھ کر بنا یا گیا ہو اور تمام اقوام کی تہذیب زبان اور عادات و اطوار پر یکساں نگاہ غائر ہو۔ انسان بذات خود اپنی عقل و فہم کے بل بوتے پر ایسے نظریہ مرتب نہیں کر سکتا کیونکہ کسی بھی بشری قانون ساز کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے کما حقہ آگاہ ہو۔ اگر وہ بہتوں کے نزدیک ہو گا تو بہتوں سے دور بھی ہو گا۔ نتیجتاً اگر وہ نزدیک کے لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے واقف ہو گا تو دور کے لوگوں کے حالات اور مسائل سے ناواقف ہو گا۔ صرف خالق کائنات ہی کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جو تمام موجودات سے یکساں قرب رکھتی ہے اور علیم و بصیر ہے۔ لہذا صرف خداۓ تعالیٰ ہی ایسا قانون مقرر کر سکتا ہے جو عالم انسانیت کے لئے یکساں سودمند ہو۔ اس لئے انسانی سعادت کے

(۱) تملکیں و فلاسفہ کے نظریات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: شیعہ در اسلام از علامہ طباطبائی اوزوی و نبوت از استاد مطہری

لئے ان بیانات کا مجموعہ ہونا ناگزیر ہے۔

لیکن جس طرح بارش اس شرط پر زمین کو بارا اور کرتی ہے کہ وہ بخوبی ہو اور ظرفیت رکھتی ہو۔ گلستان میں بچوں کھلتے ہیں لیکن کچھ میں صرف اضافہ ہوتا ہے۔ بارش پودوں کو سرسیز کرتی ہے لیکن درختوں کے زرد پتوں کو پایماں ہونے کے لئے چھینک دیتی ہے، اسی طرح وہی لوگ ارشاد پیغمبری سے مستفیض ہوتے ہیں جن کے پاس زندہ ضمیر اور ظرفیت ہو۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کے دل و دماغ فکر و احساس پر قرآن کی اصطلاح میں مہر لگ چکی ہے اور جو جانوروں سے بھی بدتر ہیں نہ صرف ہدایت ان بیانات سے مستفیض نہیں ہوتے بلکہ ان کی شقاوتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ پیغمبروں کے مقابلہ میں مورچہ بناتے ہیں اور ایسے لوگ بدنیبی کے علاوہ کچھ نہیں پاتے۔

(۱) پیغمبروں کی دو ہری حیثیت

پیغمبر دو ہری حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کا تعلق خالق حقیقی سے ہوتا ہے تو دوسری طرف خلق خدا سے۔ یہ دو طفرہ ارابط نبوت کی خاص صفت ہے۔ لفظ ”نبی“، عربی میں خبر لانے والے کو کہتے ہیں اور فارسی میں لفظ ”پیامبر“، بھی یہی معنی رکھتا ہے، عربی میں لفظ ”رسول“، کے معنی ہیں بھیجا ہوا۔ چنانچہ یہ تمام الفاظ رسول کی دو ہری حیثیت کے مظہر ہیں۔ پیغمبر خدا و خلق کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ پیغمبروں کا یہی دو ہر ارابط نہیں دوسرے انسانوں سے متاثر کرتا ہے۔ پیغمبر ایک انسان ہوتا ہے، لیکن الوہی انسان۔ ایسا انسان ہے جسے خدا نے اپنا رسول منتخب کیا ہے۔ اس نکتہ کی بلندی کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے لگایا جاسکتا ہے: ”اگر ہم ان لوگوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیں جو زبان تہذیب اور عادات و اطوار ہر چیز میں ہم سے دوری اور فرق رکھتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم کسی ایسے کا انتخاب کریں جو ایک طرف تو ہماری زبان سے واقف ہو، اور اس سطح پر ہو کہ ہمارے پیغام کو درک کر سکے اور ہم سے رابطہ برقرار کر سکے۔ اور دوسری طرف جنہیں ہم پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ان کی زبان تہذیب اور عادات و اطوار سے بھی بخوبی

آگاہی رکھتا ہوا اور بہتری یہ ہو گا کہ خود ان ہی میں سے ہو۔ لیکن اس طرح ہو کہ ہم سے بیگانہ نہ ہو۔ خدا ذات ”واجب الوجود“، کمال مطلق اور لا تناہی ہے۔ اس کے علاوہ ساری کائنات ”ممکن الوجود“، ناقص اور فانی ہے۔ لہذا اگر خداوند تعالیٰ اپنا پیغام اور شریعت بندوں تک پہنچانا چاہے تو کسی ایسی ہستی کے انتخاب کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو انسان ہو، انسان کے تمام پہلوں سے واقف ہوا و دیگر انسانوں کی طرح خود سوتا جائے، اٹھتا بیٹھتا، ملتا جلتا اور انسانی زبان بھی بولتا ہو اور دوسری طرف کمال مطلق اور واجب الوجود کے پیغام کو پہنچانے کے لئے لازمی ظرفیت، صلاحیت اور شایستگی رکھتا ہو۔ ان کی زبان بھی جانتا ہوا اور اس کی زبان بھی۔ اسی وجہ سے اسلامی تہذیب میں پیامبر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ پیغمبر ایک انسان ہے جو عہدہ رسالت کے لئے چون لیا گیا وہ بندہ بھی ہوتا ہے اور رسول بھی ”عبدہ و رسولہ۔ ما کان محمدًا باحدالا کان بشرًا رسولًا“ ان دو الفاظ (بشر اور رسول) میں پیغمبر کی اعلیٰ ترین تعریف مضمرا ہے۔

اس طرح پیغمبر انسان ہے لیکن ایسا انسان جو معنوی، روحي، فکری اور اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اسے اپنے مخصوص فیضان سے درجہ کمال عطا کر کے انسان سازی پر مامور فرمایا ہے، لیکن رسالت کا مقصد محض انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اصلاح ہے، رسول اجتماعی طور پر پوری قوم، پورے معاشرے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے ایک نئی شکل دے کر اس را پر گامزن کرتا ہے جو برہ راست خالق کائنات تک جاتی ہے۔ پیغمبر مادی سطح سے روح کی گہرائیوں کی طرف جاتا ہے اور دوبارہ وہاں سے قوم و معاشرہ کی اصلاح اور تبدیلیوں کے لئے ایک نئی الہی قوت کے ساتھ واپس سطح ہستی پر ابھرتا ہے تاکہ غیر مطلوبہ نظام و عقائد منسوخ کر کے ان کی جگہ مطلوبہ نظام و عقائد کو راجح کر کے اور دنیا یہ ہستی کو تجلیات نو سے معمور کر دے۔

ایک طرف تو پیغمبر علم الہی کا حامل ہوتا ہے (علم وہی)، دوسری طرف اس سے کسی گناہ یا غلطی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ خطا اور غلطی کی زد پر ہو گا تو ہم پیغام الہی کے ابلاغ کا ذریعہ اور اللہ کے ترجمان کی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔ پیغمبر کی شخصیت

کے دورخ ہوتے ہیں۔ ایک خدا سے پیغام وصول کرناد و سراس اس پیغام کو خلقِ خدا تک پہنچانا اور یہ امر اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کے گناہ اور اشتباه سے مبرا ہو۔ ایک طرف سے انسان ہوا اور دوسری طرف الہی انسان ہو۔

(۲) انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے

دین اسلام ایک ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد توحید ہے اور رسالت اس عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ اگرچہ خدا اور اس کی وحدانیت پر اعتقاد ہمارے دین کا محور ہے تاہم یہ اعتقاد، حضرت محمدؐ کی تعلیمات اور کلام کی سچائی پر اعتقاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں دین کے لانے والے (الہی ادیان میں) یادین کے بنانے والے (خود ساختہ ادیان میں) خود ہی اساس محور ہوتے ہیں، لیکن اسی کے مقابل، اسلام میں محور و اساس ذات باری تعالیٰ ہے اور اس لحاظ سے اہل مغرب کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام محمد زم یعنی محمدیت ہے۔ درحقیقت یہ اللہ از م یعنی خدا یت ہے۔ مگر حضرت محمد صلم کی نبوت و رسالت پر ایمان و اعتقاد رکھنے کے بعد ہی ایک مسلمان کی رسائی ذات باری تک ہوتی ہے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق انسان افضل الخلقات اور اللہ کی خلقت کا بہترین شاہکار ہے۔ اور پیغمبر انسان کامل کا نمونہ ہے۔ وہ انسان جس کی خلقت کے تمام پوشیدہ اور بالقوہ امکانات ثابت ہو چکے ہیں۔ جس طرح ایک شاہکار کسی فن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح پیغمبر انسانوں کے درمیان قدرت کے فن تخلیق کا افضل ترین نمونہ ہے۔ خدا نے اس کی خاطر کائنات کو خلق کیا ہے اور غالباً حدیث قدسی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ”لولاک لاما خلقت الا فلاک“ یعنی اے محمدؐ اگر آپ نہ ہوتے تو یہ زمین و آسمان خلق نہ کئے جاتے۔ لہذا ظاہر ہوتا ہے کہ تمام خلائق کے وجود کا سبب ذات باری ہے۔ بقول اقبال ۔

حامہ اونتش صد امروز بست تایبادہ صبح فردائے بدست شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تاچراغ بک محمدؐ بر فروخت

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ : ایک زندہ جا وید نمونہ عمل

اسلامی تہذیب میں حضرت محمد بن عبد اللہ کی شخصیت محسن ایک تاریخی شخصیت نہیں ہے بلکہ ایک ابدی حقیقت بھی ہے اور ایسی جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ پیغمبرگی ذات زمان و مکان میں ضوگن ہونے کے ساتھ ساتھ عرفان و بلندی کی بھی حامل ہے۔

حضرت محمد سے محبت اور ان کی نبوت پر یقین، تمام دنیا کے مسلمانوں کو متفق اور متحد کرنے کی سب سے اہم طاقت ہے۔ نبوت اور پیغمبر سے لگاؤ، مسلمانوں کو ایک عالمی اکائی کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ حضرت محمد سے لگاؤ اور محبت اور ان کی سنت کی پیروی کی وجہ سے، ایشیا سے لے کر افریقہ تک کے مسلمان آپس میں ہیرتاک اتحاد اور مہماں تر رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے اشعار ہیں:

از نبوت در جهان تکوين ما
نبوت هی همارا دین و آئین ما
از نبوت صد ہزار ما یک است
نبوت هی سے ہم متحد ہیں
آن کہ شان اوست یہدی من یرید
وہ جس کی شان یہدی من یرید ہے
ما زحكم نسبت او ملت ایم
هم اس سے منسوب ہونے کی وجہ سے ایک ملت ہیں
از رسالت ہمنوا گشتیم ما
رسالت ہی کی وجہ سے ہم سب ایک آواز
ایک مزاج اور ایک مقصد ہیں
یہاں تک کہ غیر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک مغربی مصنف لکھتا

ہے ”مسلمانوں کو حضرت محمد سے جو والٹگی ہے ہم ساکنان مغرب اس سے ناواقف ہیں اور مسلمانوں کے معاشرے میں عقیدہ نبوت کے عظیم کردار کو سمجھنے سے ہم قادر ہیں۔ ہم لوگ پیغمبر اسلام کو صرف ایک تاریخی شخصیت کی نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ مسلمانوں کے نزدیک ان کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دانستہ یانا و انسنة ہم مسلمانوں کی دل شگنی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ میں یورپ سے انڈونیشیا تک جہاں بھی گیا، ہر جگہ امت اسلامیکی روگوں میں عشق محمدی کو خون کی طرح جاری و ساری دیکھا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اخوت و اتحاد کی سب سے اہم وجہ یہی عشق محمدی ہے۔ البتہ پیغمبر اسلام سے مسلمانوں کی محبت مختلف انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ شمالی افریقیہ میں پیغمبر اسلام کی شان میں عارفانہ اور عاشقانہ شعرخوانی ہوتی ہے۔ بر صیریہ ہند میں پیغمبر اکرم کے یوم ولادت کو بڑے ترک و احتشام سے مناتے ہیں، قولیاں ہوتی ہیں، اس رسم کو وہ میلا کرتے ہیں۔ اسلام کی ایک شان و امتیاز یہ بھی ہے کہ اپنے مانے والوں میں پیغمبر سے اس طرح کے والہانہ عشق و محبت پیدا کرنے کے باوجود دوسرے ادیان و مذاہب کی طرح انسان اور خدا کے مابین سرحد کو گم نہیں ہونے دیا۔“

پیغمبر اسلام بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ مثلاً گناہ و اشتباہ سے ان کا محفوظ ہونا، ان کی بے نظیر رہنمائی، لا جواب قوت تشكیل و تعمیر، شرک و اوہام اور جور و استبداد سے بے مثال نبردازی مانی وغیرہ۔ اس کے باوجود مسلمان اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ ان کے نبی بشر تھے۔ مسلمان ہر روز متعدد بار دہراتے ہیں اور کہتے ہیں اشہدُ آنَّ مُحَمَّدًا أَعْبُدُهُ وَأَرْسُؤْلَهُ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صرف خدا کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں) اور یہ نکتہ تاریخ ادیان عالم میں بے نظیر اور بے مثال ہے۔

اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حضرت محمدؐ کی وہ ذات ہے جو محبوب خالق اور منتخب خالق تھی، وہ شخصیت ایسی تھی جس کے لئے زمان و مکان بنائے گئے، یعنی محمدؐ بشر تھے، اور تمام ضرورتیں جو بشریت کے تقاضے کے تحت ہیں ان کے اندر موجود تھیں اور دوسروں کی طرح مکف

تھے یعنی ان احکام کو، جو ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچتے تھے، انجام دیں بلکہ بعض مشکل احکام ان کے لئے مختص تھے۔ مثلاً رسول خدا پر تجدید نافذہ شب واجب تھیں۔

دیگر مذاہب میں پیغمبر والی تصور پیدا ہو گیا ہے اور جس محنت و ریاضت کو عام لوگوں کے لئے تجویز کیا ہے وہ خود ان سے ساقط تھی۔ اس کے برعکس اسلام میں پیغمبر اسلام نے خود کو کسی محنت و ریاضت سے کبھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا بلکہ دوسروں کی طرح ان سے زیادہ خوف خدادل میں تھا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عبادت کرتے تھے، زیادہ نمازیں پڑھتے تھے، زیادہ روزے رکھتے تھے، جہاد کرتے تھے، خلق خدا پر احسان کرتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کے لئے کوشش رہتے تھے۔ زندگی گزارنے کے لئے کسی کا بوجھ نہیں بنے۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کی اہمیت و عظمت کو دوسرے ادیان جیسے بودھ مت اور عیسائیت میں مذہبی رہبروں کے سلسلے میں موجود عقائد اور اسلامی عقیدے سے مقابلی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان اپنے پیغمبر سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ (حضرت محمد) خاتم المرسلین، افضل الانبیاء تھے، محبوب رب انبیٰ تھے اور مصلحت تخلیق زمان و مکان تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام صرف مسئلہ وحی اور لوازم وحی (جیسے عصمت و محجزہ وغیرہ) کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے مختلف تھے۔ وہی انہیں انسانیت سے خارج نہیں کرتی بلکہ انسانیت کا ایک اعلیٰ وارفع نمونہ بنائی کر پیش کرتی ہے۔ انہی وجہوں دلائل کی بناء پر وہ دوسروں کے رہبر و رہنماء ہیں۔

پیغمبر اسلام کا دیگر دینی رہنماؤں اور دین لانے یا بنانے والوں پر دوسرا بڑا امتیاز نبُردازیٰ، جہاد اور تعمیر و تکمیل ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب میں پیغمبر یادیٰ پیشوائے متعلق تصور صرف معنوی، روحانی، رہبانی تصور تھا۔ غیر اسلامی ادیان و مذاہب میں نبوت و بعثت کا مقصد صرف تزکیہ روح اور اخروی سعادت کا حصول تھا، جہاں دین کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سیاست و معاشرہ، دینی رہبروں کے دائرہ کا رہ تھا۔ لیکن اسلام میں نبوت کا مقصد خدا کی معرفت اور اس کا تقریب اور اسی کے ذریعہ علم بے انصافی اور جہالت وغیرہ کے خلاف نبُردازیٰ ہے۔

اسی وجہ سے پیغمبر اسلام دیگر مذاہب کے لانے اور بنانے والوں کے برعکس محض ایک ”پیغام پہنچانے والے“ نہ تھے، بلکہ انہوں نے پیام الہی کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد کے لئے بھی قدم اٹھائے اور شرک و اہام اور ظلم و جہالت کی پیغام کنی کے لئے نبُردازی بھی ہوئے اور ایسے سماج و تہذیب کی بنیاد رکھی اور ایک ایسی امت بنائی جس نے قیصر و کسری کے مخلوقوں کو لرزہ براندام اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو رنگوں کر دیا۔

پیغمبر کے متعلق یہ تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے اور جو حضرت محمدی زندگی میں جسم ہوا ہے، دیگر ادیان میں دینی پیشواؤں کے تصور سے بالاتر ہے۔ دیگر مذاہب میں رہبروں کے عرفانی و روحانی تجربات سماج سے دوری، صحر اور پہاڑ یاد یاد نہیں کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں جیسا کہ علامہ اقبال نے نشاندہی کی ہے: ”پیغمبر محرفانی تجربات کی گہرائیوں سے سماجی زندگی تک واپس آتا ہے اور زمانے کے حالات میں داخل ہوتا ہے تاکہ تاریخ کے بہاؤ کو قابو میں کرے اور اس طریقے سے کمال مطلوبہ کی ایک نئی دنیا خلق کر سکے۔“

اس طرح بقول استاد شہید مطہری^(۱) ”اسلام میں پیغمبر روحانی راستوں سے خلق کی طرف سے خالق کی طرف رجعت کرتا ہے یعنی سیر من الخلق الی الخالق لیکن اس کا صریحیٰ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ان ہی راستوں سے خلق کی طرف واپس آتا ہے تو اپنے ساتھ ایک ارادہ لے کر لوٹتا ہے، حیات انسانی کی اصلاح کا ارادہ اور اس طرح سیر علی الخلق فی الخلق پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔“^(۱)

اسلام کی یہی دو باتیں یعنی پیغمبر کا انسان ہونا اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں پیغمبر کی عملی شمولیت کے باعث ہی پیغمبر اپنے ماننے والوں کی آئندہ نسلوں کے سامنے نمونہ کے طور پر سامنے آئے، جب کہ دوسرے مذاہب ایک مذہبی پیشواؤں کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی ذات اس مذہب کے پیروؤں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام کی ذات تمام

(۱) استاد مطہری: مقدمہ ای بر جہاں یعنی اسلامی

افعال مسلمانوں کے واسطے قیامت تک کے لئے ایک نمونہ ہے۔ دنیا کے کسی حصہ اور کسی زمانہ کے اسلامی انقلاب میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہے جس کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی نمونہ نہ ہو۔

پیغمبرؐ کی تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے

- ۱ تحریف کرنے والے (مسیحی اور یہود جنہوں نے آسمانی کتابوں میں حسب مشاہد بیلیاں کیں)
- ۲ فکری اور اخلاقی مادہ پرست (اکثر مشرکین قریش اسی گروہ سے متعلق تھے جو نفس اور شکم کے پچاری تھے)
- ۳ مکہ و مدینہ کے سیاست داں، صاحبان اقتدار اور قوم پرست افراد۔

مکہ اور مدینے کے سیاست داں، قوم پرست اور طاقتوں لوگ (ابوسفیان، ابو جہل اور ابو لهب قریش کی قوم پرستی کے نمائندے اور عبد اللہ بن ابی مدینے کی قوم پرستی کے نمائندہ)، حیرہ، عسان، ایران و روم سے متعلق افراد (اس زمانے کی بڑی طاقتیں اور ان کے کارندے) سیاسی طاقتیں، اقتصادی طاقتیں، کعبہ کے متولیوں اور درباری مذہب کی رسمی طاقت، پیغمبر اسلامؐ نے ان سب کے سلسلے میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کر دیا۔ ۱۲ ارسو برس بعد اسلامی انقلاب بھی انہی محاذوں سے بر سر پیکار ہوا۔ اس طرح پیغمبر اسلامؐ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے زندہ موجود نمونہ عمل ہیں۔

حضرت فاطمہؓ کا اسوہ جاوید

حضرت فاطمہؓ زہرا صلوات اللہ علیہا^(۱) پیغمبر اسلام کی دختر ارجمند، جن سے رسول اکرمؐ کی ذریت و نسل طاہر دنیا میں باقی ہے، حضرت علیؓ شیر خدا کی زوجہ اور شیعوں کے گیارہ اماموں کی مادر گرامی ہیں جن کو اسلام نے خواتین کے لئے نمونہ بنایا کہ پیش کیا ہے۔

اسلام نے محض کتاب اور شریعت پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ آئین کے ساتھ بعض شخصیتوں کو راہنماء اور عملی نمونے کے طور پر منتخب کیا ہے تاکہ وہ کتاب کی تعلیم اور اسلام کی روح اور اس کے جوہر کو اپنے کردار عمل کی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر اور بارہ امام اسی طرح کے نمونے ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے مرد و عورت کو مختلف خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بہت سے ایسے حالات، کیفیتیں، جذبات اور تعلقات خواتین میں پائے جاتے ہیں جو مرد میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ اسلام، پیغمبر اور انہم کے ساتھ ساتھ، عورتوں کے لئے بھی خاص نمونہ اور اسوہ پیش کرے۔ ایک ایسی ہستی جو یہ بتائے کہ ایک مسلمان خاتون کو کیسا ہونا چاہئے؟ باپ، شوہر، فرزند اور سماجی و سیاسی زندگی کے سلسلے میں ایک عورت کا کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ جناب فاطمہؓ ایسی ہی ہستی ہیں جنہیں اسلام نے ایک مثالی خاتون کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اسلام نے جناب فاطمہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”مریم اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین خاتون تھیں مگر تم ہر زمانہ اور ہر صدی کی اعلیٰ ترین خاتون ہو۔“

اس طرح جناب فاطمہؓ زہرا تمام خواتین کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہیں۔ نامور مصری محقق عباس محمود العقاد بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”ہر دین میں ایک ایسی مقدس اور کامل خاتون کا وجود ہوتا ہے جسے اس دین کے ماننے والے خداوند تعالیٰ کی نشانی سمجھتے

(۱) توفیق ابو علم، ”فاتحہ زہرا“، ج ۱، ص ۱۱

ہوئے اس کی تقدیس کے معتقد ہوتے ہیں، عیسائی مذہب میں جناب مریم کا وجود مقدس اور افضل مانا گیا ہے، اسی طرح اسلام میں حضرت زہراؤ ایک مثالی خاتون ہیں۔^(۱)

ہر دین میں ایک مقدس خاتون کامل، اس دین کی تعلیمات اور خصوصیات کا عملی مظہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تحریف شدہ میسیحیت چونکہ رہبانیت، گوشہ نشینی اور معاشرے سے بے تعلق ہو کر معنویت اور روحانیت سے منسلک رہنے کا عقیدہ پیش کرتی ہے، اس لئے مذہب کی مثالی خاتون یعنی مریم عذر اکی جو شکل مسیحی پیش کرتے ہیں وہ ان ہی خصوصیات کی مظہر ہے۔

لیکن اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے متعدد پہلو ہیں۔ اسلام میں معنویت، اجتماعی و سیاسی زندگی سے تعلق، عبادت، خاندانی اور گھریلو ذمہ داریاں، عرفان اور جہاد یعنی زندگی کا ہر رخ موجود ہے۔ حضرت زہراؤ نے بھی جو اسلام کی مثالی خاتون ہیں، جن کی پاکیزہ سیرت تمام مسلمان خواتین کے لئے نمونہ ہے، اپنی زندگی میں دین اسلام کے ہر رخ کو پیش فرمایا ہے۔ اکثر علماء و محققین مثلاً تقبی سکی، جلال سیوطی، رکشی اور تقبی مقریزی تمام دنیا کی خواتین پر حضرت فاطمہ زہراؤ کی افضیلیت اور ان کے کردار اور مثالی سیرت کے معرفت ہیں اور اس کا نامیاں طور پر ذکر بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ تقبی سکی جو علمائے اہل سنت میں سے ہیں اس سوال کا کہ ”اسلام میں افضل ترین خاتون کون ہیں؟“ یوں جواب دیتے ہیں ”میرا عقائد ہے کہ فاطمہ ذخیر محمد ساری دنیا کی عورتوں میں افضل ترین خاتون ہیں۔“ این داؤ دنے اسی سوال کے جواب میں کہا ہے کہ ”جب پیغمبر خدا نے جناب فاطمہ زہراؤ کو اپنے جسم کا ایک نکڑا کہا ہے تو اب اس کے بعد کسی اور کائن سے افضل ہونا قطعی ناممکن ہے، اس لئے کہ پیغمبر کے جسم کے نکڑے پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

معتبر احادیث و اخبار کے مطابق پیغمبر اسلام نے خود جناب فاطمہ زہراؤ کو ”دنیا کی تمام عورتوں کی سردار“ کہا ہے اور ان کی پاکیزہ سیرت کو خواتین عالم کے لئے تاریخی نمونہ بنانا کر پیش کیا ہے۔ اہل سنت کی معتبر کتابوں میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول خدا نے جناب فاطمہ

(۱) توفیق ابوعلم، ”فاطمہ زہراؤ“، ص ۱۵

سے کہا: ”جان پر فاطمہ! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم تمام خواتین سے افضل اور میری پوری امت کی خواتین کی سردار ہو اور با ایمان عورتوں میں سب سے برتر ہو؟“

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول خدا نے جناب فاطمہ سے پوچھا: ”اے جان پدر! کیا تمہیں یہ جان کر خوش نہیں ہوئی کہ تمام عالم کی خواتین میں سب سے افضل و برتر ہو؟“ جواب میں جناب فاطمہ زہراؤ نے سوال کیا کہ ”اگر میں سب سے افضل ہوں تو مریم بنت عمران کیا ہیں؟“ رسول اللہ نے فرمایا ”وہ صرف اپنے دور کی خواتین میں سب سے افضل ہیں اور تم ہر دو کی خواتین میں سب سے افضل ہو۔“ اس طرح جناب فاطمہ زہراؤ نیکی تمام خواتین کے لئے ایک مثالی خاتون اور اسوہ جاودیدیں۔

انھوں نے نمونہ پیش کیا ہے کہ ایک مسلمان خاتون کو کس طرح روحانیت سے بھی متعلق رہنا چاہئے اور خاندان کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اور عقیدتی جہاد میں شامل رہنا چاہئے۔ حضرت فاطمہ زہراؤ کی زندگی میں ہم عرفان، امور خانہ داری کی انجام دہی، اور اجتماعی و اعتمادی جہادوں پہلوؤں کو اپنے عروج پر پاتے ہیں۔

مبالغہ جناب فاطمہ زہراؤ کے معنوی و عرفانی مقامات کی رفتہ کی ایک ابدی سند ہے۔ مبالغہ کے تاریخی واقعہ میں بخراں کے نصارا جو عبادت و ریاضت میں مشہور تھے، ان سے مقابلہ میں روحانی و معنوی اعتبار سے پورے گروہ اسلامی میں صرف پانچ افراد منتخب کیا گیا، ان پانچ روحانی افراد میں سے ایک فرد جناب فاطمہ زہراؤ ہیں۔ نصاری اپنی معنوی قوت پر بہت نازاں تھے، بخراں خدائی ہستیوں کے مقابلہ ٹھہر نے کی جرات نہ کر سکے۔ ابو حارثہ اسقف نصاری مبالغہ سے روگردان ہو گیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ ”تونے محمد سے مبالغہ کا خیال ترک کیوں کر دیا؟“ تو اس نے جواب دیا ”خدا کی قسم میں نے ایسے چہرے دیکھے جو اگر دعا مانگیں تو پہاڑ حرکت میں آجائیں، اور اگر ہمارے حق میں بد دعا کریں تو سال نہ گذرے کہ نصاری میں سے ایک شخص دکھائی نہ دے اور ان کی بد دعا سے سب کچھ تباہ ہو جائے۔“

یہ واقعہ مکمل طور پر حضرت فاطمہ زہراؓ کے اعلیٰ عرفانی و معنوی منزلت کی نشاندہی کرتا ہے۔ مسیحیت کے برخلاف اسلامی عرفان و معنویت رہبانتیت یاریا ضت کرنے والوں کا عرفان نہیں ہے، بلکہ ایک جہاد مسلسل ہے جہاں انسان اجتماعی زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کا عملی نمونہ جناب فاطمہ زہراؓ نے پیش کیا ہے جو تمام دنیا کی عورتوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ زہراؓ نے بعض غزوات میں بھی شرکت کی اور پیغمبرؐ نے اجتماعی مسائل میں آپ سے مشورے بھی لئے ہیں اور جنگوں میں بعض ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی تھیں۔

جناب فاطمہ زہراؓ نے معاشرے کی اجتماعی اور فکری زندگی میں بھی شرکت کی ہے، پیغمبرؐ کی حدیثیں بھی بیان فرماتی تھیں، خواتین کی ہدایت بھی کرتی تھیں، جنگوں میں حصہ بھی لیتی تھیں اور وقت ضرورت تلواروں اور تیروں کی بارش میں اپنے والد اور اپنے شوہر کا ساتھ بھی دیتی تھیں، پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، زخموں کی مرہم پٹی اور نگہداشت بھی کرتی تھیں اور لشکر اسلام کی غیرت کو بھی لکھارتی تھیں۔^(۱) واقدی نے لکھا ہے کہ ”حضرت فاطمہ زہراؓ نے جنگ احمد میں مجرموں کی مدد کی اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی وہ اپنے والد ماجد کی معاون رہی ہیں جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ جب خواتین پیغمبرؐ کی بیعت کر رہی تھیں تو وہ جناب رسول خدا کے ساتھ تھیں۔

پیغمبرؐ کے بعد بھی جناب زہراؓ اسلامی معاشرہ کی خبر گیری کرتی رہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جناب فاطمہ زہراؓ وہ پہلی طاقتور تھیں جو فریاد کرنے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے مسجد بنوی میں گئیں آپ کی شعلہ بیان اور زلزلہ افغان تقریر آپ کی شجاعت، شہامت الہی نگاہ اور سیاسی و اجتماعی دوریوں کو واضح کرتی ہے۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ عورت اسلامی معاشرہ میں اجتماعی سیاسی اور عورتوں کے بارے میں پیدا ہونے والے مسائل سے کنارہ کش نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ کی قسمت

بنانے حصہ لینے کے بعد بھی مسلم عورت کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ ”عورت“ ہے۔ ایسی صورت میں اسے اپنی عفت، اپنے قدس اور پرودہ کو برقرار رکھنا چاہئے۔ جناب سیدہؓ نے اپنی رفتار و گفتار سے مذکورہ بالا باتوں کو آشکار کیا ہے۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ ”کون سی چیز خواتین کے لئے سب سے اچھی ہے؟“ کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ حضرت علیؓ نوراً جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس گئے اور ان سے اس سوال کے متعلق دریافت کیا۔ جناب فاطمہ زہراؓ نے کہا: ”آپ نے کیوں نہ کہہ دیا کہ خواتین کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ مردوں کی جانب نظر نہ کریں اور مردوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خواتین سے مرعوب نہ ہوں؟۔“ حضرت علیؓ جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں تشریف لائے اور بھی جواب دہرا یا۔ رسولؐ خدا نے فرمایا: ”اے علیؓ! تم کو اس سے کس نے مطلع کیا؟“ حضرت علیؓ نے جواب دیا: ”فاطمہ نے۔“ اس پر پیغمبرؐ نے فرمایا ”جس تو یہ ہے کہ فاطمہ نے میرے ہی جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔“ جناب زہراؓ نے ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان خاتون اسلامی معاشرے میں اپنی نسوانیت، عفت اور خودداری کے تحفظ کے ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی شرکت کی حقدار ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان خاتون، خاندان کی خدمات انجام دینا اور نسل کی پرورش و پرداخت کو پنا فریضہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہراؓ ایک طرف عرفانی اور روحانی مقامات میں آیت تطہیر کی تفسیر ہیں، دوسری طرف اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی ذمیل ہیں۔ خاندانی اور گھریلو ماحول میں ایک الگ شعار شریک حیات، ایک دختر و فادر اور ایک مادر مہربان بھی ہیں۔ جناب فاطمہ زہراؓ وہ الگ شاعر تھیں جو فریاد کرنے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے مسجد بنوی میں پرستار، مشیر، رفیق اور معین بھی ہیں۔ تکلیفوں میں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور انھیں تسلی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں ”امِ ابیحَا“ یعنی اپنے باپ کی ماں کہتے ہیں۔

جناب فاطمہ زہراؓ شوہر کے لئے ایک مہر و محبت کرنے والی شریک حیات، حضرت علیؓ کی

(۱) رجوع کیجئے: ”فاطمہ زہرا“، از توفیق ابوعلم، ص ۱۱۱ اور ۱۲۳

موس تہائی ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ مسلسل دکھ درجھیل رہی ہیں لیکن پیشانی پر شکن تک نہیں آنے دیتی ہیں۔

جناب زہرؓ ایک ایسی ماں ہیں جن کی آغوش میں حسن و حسین اور زینبؓ جیسی اولاد پروان چڑھتی ہے۔ عبادات و اخلاق بلکہ ہر لحاظ سے جناب فاطمہ زہرؓ بلا تفریق ہر ایک کے لئے نمونہ ہیں۔

جناب فاطمہ زہرؓ: اسلام میں عورت کے بلند مقام کا مظہر

جناب فاطمہ زہرؓ اسلام میں خواتین کے مرتبہ کی عظمت و رفتت کی مظہر ہیں۔ تاریخ عالم میں پہلی بار اسلام نے خواتین کو باعتبارِ شخصیت انسان کامل بتایا ہے۔ یہاں تک کہ یونان جیسے ترقی پسند نظام میں بھی خواتین کو شانلوی درج دیا جاتا تھا حتیٰ کہ ظہور اسلام تک خود عرب عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں پست تر گردانتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں عربوں میں ایک مشہور تھی "المراة حیوان طول الشعور قصیر الفکر" یعنی عورت ایک ایسا جانور ہے جس کی زفہی طویل مگر عقل کوتاہ ہے۔ دو صد یوں قبل تک نام نہاد متمدن مغربی ممالک میں بھی خواتین انفرادی حق ملکیت سے محروم تھیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں اسلام نے خواتین کو ایک کامل انسانی شخصیت عطا کی اور "صنف" کے بجائے "تقویٰ" کو بزرگی، برتری اور عظمت کا معیار قرار دیا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؓ نے اعلان فرمایا: "المرأة الصالحة خير من الرجل غير صالح" یعنی ایک متقدی عورت ایک ہزار غیر صالح مردوں سے بہتر ہے۔ (جامع الاخبار) اور فرمایا: "من اخلاق الانبياء حب النساء" قرآن صریح طور پر اعلان کرتا ہے: {لِلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ} (نساء / ۳۲) "مردوں کو حصہ ملتا ہے ہر اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے جو وہ حاصل کریں اور اللہ سے سوال کرو اسی کے فضل و کرم سے یقیناً اللہ ہر چیز کا جانے والا ہے۔" {لِلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

وَالْأَقْرَبُونَ} (نساء / ۷) "مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز ترکہ چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز چھوڑ جائیں چاہے وہ کم ہو یا زیادہ لازمی طور پر مقرر کیا ہوا حصہ۔" قرآن نے یہ حکم بھی دیا: "عاشر و هن بالمعروف" اور پیغمبرؓ نے فرمایا: "وَلَا تضر بِوَالنِّسَاءِ كُمْ فَمَنْ ضَرَبَهُنَّ بِغَيْرِ حَقٍ عَصَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ" یہ تمام آیات اور حدیثیں خواتین کی اس شخصیت اور احترام کو ظاہر کرتی ہیں جس کا اسلام قائل ہے۔ اسلام نے عورت کو مکمل انسانی حقوق دئے اور اس کی روحانی، فکری اور سماجی ترقی اور عظمت کے لئے راہ ہموار کی۔

اسلام میں عورت کی عظمت و بلندی اور ترقی و ارتقا کا جو نظر یہ ہے وہ مغربی تمدن کے نظریہ ارتقاء سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام عورت کو اپنی نسوانیت اور عورت ہونے کی خصوصیت کے تحفظ کے ساتھ ترقی کرنا سکھاتا ہے۔ جبکہ مغربی تمدن عورت کو اپنی نسوانیت، اصل خاصیت اور اپنے حقیقی جوہر سے دست بردار ہو کر ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ترقی عورت کو زمرة نسوانیت سے خارج کر دینا ہے، عورت کی ترقی نہیں ہے! مغرب یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی ترقی ناممکن ہے جب تک وہ شکل و صورت کے اعتبار سے مرد نہ بن جائے۔ دراصل یہ عورت کی سب سے بڑی تحریر ہے جو حقوق نسوان کے تحفظ کے نام پر انجام دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام چاہتا ہے کہ عورت اپنی اصل صورت اور خصوصیت کا تحفظ کرے کیونکہ عورت کی اصل شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور عورت اپنے فرائض و مقاصد کو جو مرد کے فرائض و مقاصد سے کسی طرح بھی کم تر نہیں ہے، کو فراموش نہ کرے۔ عورت کو نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے اغراض و مقاصد اور فرائض میں ایک بڑا فریضہ آنے والے معاشرے کی مستقبل کی نسلوں کو پیدا کرنا اور ان کی تربیت ہے۔ اور ایک عورت کے لئے یہ قطعی نامناسب ہے کہ وہ انسان سازی جیسے عظیم فرض کو چھوڑ کر "مشین سازی" کو اپنائے، جیسا کہ مغربی تمدن کا شعار ہے۔ اسلام "مساوی حقوق" کا قائل ہے، "مشابہ حقوق" کا نہیں۔ جبکہ اہل مغرب مساوی حقوق کے نام پر مشابہ حقوق کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور عورت سے

اس کی برتر اور عظیم نسوانی شخصیت چھین کر اسے مردانہ وضع دینا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی تہذیب، گروہ یا فرد کہتا ہے کہ عورت کو چاہئے کہ وہ پہلے مردانہ وضع قطع اختیار کرے، اس کے بعد وہ احترام کے قائل ہوگی تو ایسی تہذیب، گروہ یا فرد صرف مردوں کے احترام کا قائل ہے، اس نے درحقیقت عورت کی توہین کی ہے۔

اسلام میں عورت اپنی نسوانیت اور اپنے عورت ہونے کا تحفظ کرتی ہے اور اپنی مخصوص ذمہ داریوں یعنی اولاد کی تربیت اور صحیح وسائل کی تربیت کو فراموش نہیں کرتی، اس کے ساتھ ساتھ خدمت دین، خدا اور انسان کی خدمت، جدوجہد اور کوشش، غرض کے معاشرہ کے ہر موڑ پر شریک ہونے کے باوجود اپنی برتری، اپنی قدر و منزلت اور اپنا احترام برقرار رکھتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا اس بلندی کا مظہر ہیں جو عورت اسلامی معاشرے میں حاصل کر سکتی ہے۔ اسلام میں عورت کا جو تصور ہے حضرت فاطمہ اس کی مکمل ترین تصویر اور اسلام میں عورت کی جو رفتہ و منزلت ہے اس کی کامل مظہر ہیں۔

حضرت فاطمہ عورت ہونے کے باوجود آئیہ تطہیر کی مصدق ہیں، پنجتن کی ایک فرد ہیں جو مبالغہ میں پیغمبر اسلام کے ہمراہ تھیں اور تاریخ اسلام کی چودہ مقدس ترین عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا کہ ایک عورت روحانی، فکری اور نظریاتی ارتقاء کی چوٹی تک پہنچ سکتی ہے۔ حضرت فاطمہ وہ خاتون ہیں جنہیں اسلام، تمام انسانوں کے لئے ایک نمونہ مثال بنانے کا پیش کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام اور تمام مسلمانوں کے نزدیک جناب فاطمہ کی جو عظمت و منزلت ہے وہ اسلام میں عورت کی رفتہ و قدر و تیمت کو ظاہر کرتا ہے۔

شیعہ سنی تمام روایتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ جناب فاطمہ پیغمبر اسلام کے نزدیک محبوب ترین فرد تھیں اور رسول خدا ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ حاکم نے ”متدرک“ میں شعبہ سے نقل کیا ہے کہ ”رسول خدا جب بھی سفر یا جنگ سے لوٹتے تھے تو مسجد کے بعد سب سے پہلے جناب

فاطمہ کے پاس جاتے تھے۔“ ابن سعد نے اپنی کتاب ”شرف النبوة“ میں لکھا ہے کہ ”پیغمبر نے کہا اے فاطمہ! اللہ تعالیٰ تمہارے غضب سے غضباً ک ہوتا ہے اور تمہاری خوشنودی سے خوش ہوتا ہے۔“ کتاب ”استیعاب“ میں لکھا ہے کہ ”عایشہ سے لوگوں نے پوچھا کہ رسول خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟“ جواب دیا ”فاطمہ“ اور تمذی میں اسماعیل بن زید سے روایت ہے کہ پیغمبر نے کہا: ”فاطمہ تمیرے نزدیک محبوب ترین فرد ہیں۔“ پیغمبر کے نزدیک یہ تمام عظمت، اہمیت اور احترام جو جناب فاطمہ کے لئے تھا یا جو تعلق رسول کو جناب فاطمہ سے تھا اس کی وجہ مغض باپ اور بیٹی کا رشتہ ہی نہ تھا کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ایک عام انسان نہ تھے بلکہ ایسے فرد تھے جن کے متعلق قرآن فرماتا ہے: {وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى} (نجم: ۳-۴) یعنی پیغمبر جو کہتے یا کرتے ہیں مرضی و منشاء الہی کے عین مطابق ہوتا ہے۔“ دوسرا بات یہ کہ ایک باپ فطری طور پر اپنی بیٹی سے الفت، محبت کرتا ہے نہ کہ اس کا خصوصی احترام اس کی تعظیم کرنا اور اسے ”ام ابھا“ یعنی باپ کی ماں کہنا اور اعلان کرنا کہ اس کا غصہ خدا کے عتاب کو برائی گھنٹتے ہے اور اس کی خوشی خدا کو خوش کرتی ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول خدا جناب فاطمہ کی عظمت و کردار ان کے فرائض اور ان کی معنوی شخصیت کی وجہ سے ان کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت ہونا فضیلت کو سلب نہیں کرتا بلکہ اگر عورت انسانی و معنوی فضائل کی حامل ہے تو اسلام دوسروں سے زیادہ اس کی عظمت کا قائل ہے۔

پیغمبر اسلام جب جناب فاطمہ کی اس قدر تعظیم اور احترام کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہر زمانے اور ہر دور کے مسلمان جناب سیدہ کے لئے کس قدر عظمت و احترام کے قائل ہوں گے۔ تمام علمائے اسلام جناب فاطمہ کی خاک پا ہونے پر فخر کرتے ہیں اور انہیں اعجاز قرآنی کا ثابت کرنے والا اور پیغمبر اسلام کے دعویے رسالت کی صحت پر گواہ تسلیم کیا گیا ہے، کیونکہ جناب فاطمہ زہرا وہ واحد ذریعہ ہیں جن کے توسط سے پیغمبر اسلام کی نسل دنیا میں محفوظ ہے، قرآن کی پیشین گئی صحیح

ثابت ہوئی اور کفر رسوأ ہوا۔ کفار اور مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر اسلام مقطوع لشل ہیں، جبکہ قرآن حکیم اعلان کر چکا تھا کہ {إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكُوثرَ} [یعنی ہم نے تمہاری نسل کو کثرت عطا کی۔ بے شک تمہارے تمام دشمن ابتر ہیں۔ اور یہ کوثر رسول خدا کو جناب سیدہ کی صورت میں عطا کی گئی۔ اس طرح مونین اور علمائے اسلام کے نزدیک جناب فاطمہ صرف رسول خدا کی محبوب صاحبزادی ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی شخصیتوں میں مقدس ترین شخصیت، قرآن ناطق، صحت دعوائے رسالت کی گواہ اور اعجاز قرآنی کی ثابت کرنے والی بھی ہیں۔

جناب فاطمہ زہرا س روحانی عظمت کی حامل ہیں کہ انہیں 'بتول' کہا گیا ہے۔ بتول ایسی خاتون کو کہتے ہیں جس کے رشتے دنیا سے منقطع اور حق سے استوار ہو جاتے ہیں۔ 'مجموع البحار' میں آیا ہے کہ حضرت مریمؑ اور جناب فاطمہ زہرا دونوں کو 'بتول' کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مقدس خواتین وہ تھیں جن کے رشتے دنیا سے منقطع ہو کر حق سے استوار ہو چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کو مسلمان صدیقہ، مبارکہ، طاہرہ، راضیہ اور مرضیہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر لقب ان کی عظمت کے کسی نہ کسی رخ کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک طرف تو جناب فاطمہ زہرا مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ ہیں۔ ایسی خاتون جیسی اسلام چاہتا ہے، ایسی نمونہ خاتون جسے پیغمبر اسلام نے خود اپنے دست مبارک سے سانچہ میں ڈھالا اور اپنی پر التفات تربیت کے زیر سایہ پروان چڑھایا۔ دوسری طرف وہ اسلام میں خواتین کی برتری اور بلندی کی مظہر بھی ہیں۔

امامت و ولایت: البعاد (Dimensions) اور مفہوم

امام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی سماجی، سیاسی، علمی یادی نی تحریک کے سلسلے میں کسی گروہ کی رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے۔^(۱) امام اچھی صفات اور معنوی کمالات میں سرآمد خلق اور سیاسی، سماجی، علمی اور فکری میدان میں انسانوں کا رہبر اور پیش رو، اور انفرادی و سماجی برداشت میں ان کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔^(۲) امام وہ شخص ہے جو آسمانی دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوا ہے۔ وہ شخص جو خدا کے حکم اور نص کی بنیاد پر امت کی رہبری اپنے ذمے لیتا ہے۔ امام نہ صرف دنیوی اور ظاہری خلافت میں پیغمبر کا جاثیں ہے بلکہ پیغمبر کے علم باطنی اور روحانی خصوصیات کا بھی حامل اور اس کے دین کا شارح بھی ہے۔

نبوت و امامت میں تعلق

لفظ "نبی" عربی میں "خبر لانے والے" کے معنی میں ہے اور فارسی میں اس کا ترجمہ پیامبر یا پیغمبر ہوتا ہے۔ لفظ "رسول" بھی "بھیجھے ہوئے" کے معنی میں ہے۔ انہیاء ایک قبول کرنے والی (Receiving) مشین کی طرح ہیں جو بشریت کے جسم میں لگاؤ گئی ہیں۔ وہ لوگ اللہ کی طرف سے منتخب افراد ہیں اور ان کے اندر یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ الہی پیغام کو دریافت کریں اور انسانی معاشرے تک پہنچائیں۔ انہمہ اور اوصیاء اسی پیغام کی حفاظت کرنے اور پھیلانے والی (Transmitting) مشین ہیں۔ انہوںہ لوگ ہیں جو انہیاء کے پیغام کو سماج میں نافذ کرتے ہیں۔

ہرامت پیغمبر اور پیغمبر کے بعد اس امت کا امام، معنوی و علمی درجات کے لحاظ سے سرآمد

(۱) رجوع کیجئے: "شیعہ در اسلام" از علامہ طباطبائی، ج ۲۳

(۲) اصل الشیعہ واصولہ، از شیخ محمد حسین کاشف الغطا، فصل امامت

خلق اور بلند مرتبے کے حامل اور سب سے افضل ہیں۔ قرآن کے رو سے کبھی کبھی نبوت و امامت ایک جگہ اکٹھا ہو جاتی ہیں اور ایک فرد رسالت و امامت دونوں عہدوں پر فائز ہو جاتا ہے۔ نبی شریعت کو لوگوں تک پہنچاتا بھی ہے اور اس کو معاشرے میں نافذ بھی کرتا ہے اور روحانی و مادی امور میں لوگوں کی رہبری کرتا ہے۔ قرآن میں پیغمبروں کا امام کے ذریعے تعارف کرایا گیا ہے۔

إِنَّمَا جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا۔ (بقرہ: ۱۲۳)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدِيُونَ بِأَمْرِنَا۔ (انبیاء: ۷۳)

حضرت محمد رسول بھی تھے اور امام بھی۔ پیغام کے لانے والے بھی تھے اور اس کی وضاحت کرنے والے بھی اور امت کے لئے نمونہ اور روحانی رہبر تھے۔ پیغمبرؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، معاشرے میں صرف شریعت و قانون رہ گیا، لیکن قانون کے مفسر اور شارح کی جگہ خالی ہو گئی۔ اس وجہ سے رسول خدا کے بعد ایسے افراد کی ضرورت تھی جو خدا کی طرف سے منصوب ہوں، علم الہی کے ابدی سرچشمہ سے منسلک ہوں، روحانی خصوصیات کے وارث ہوں، اسلام پھیلانے والے اور مقاصد کی تشریح کرنے والے، اسرار باطنی اور روح شریعت سے آشنا ہوں۔

اس طرح جب پیغمبر اسلامؐ کے بعد نبوت ختم ہو جاتی ہے تو امامت اور حفاظت شریعت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

اماamt اور ولایت کی ضرورت

(الف) اللہ کے عنایت و فضل کی اصل اور ہدایت عامہ کی اصل جو ظہور انیاء کا وجودی سبب ہے، بقائے امامت کی وجہ بھی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق چونکہ خداوند عالم ”اجب الوجود بالذات“ ہے، فیاض مطلق ہے، یعنی اپنی کمال وجود کی وجہ سے اپنے مختلف فضل و عنایت کو مخلوقات سے دریغ نہیں کر سکتا ہے۔ خلاقيت تو انکی اور کمال ”فیاضی“ کا لازمہ ہے۔ ناقص انسان کی سطح پر بھی ایک عظیم فنکار کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے فن پاروں پر عنایت کی نظر نہ کرے اور اس کو کسی پہلو سے ناقص چھوڑ دے۔ جب ناقص افراد کا یہ حال ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم اپنی مخلوقات سے ناقص چھوڑ دے۔ کو بغیر اصلاح اور ہدایت کے چھوڑ دے اور سعادت حاصل کرنے کے موقع فراہم نہ فرمائے۔ ہدایت و عنایت خداوندی تمام مخلوقات کے لئے ہے خواہ ایک ذرہ بے ما یہ ہو خواہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیزیں۔

اسی ہدایت عامہ اور فضل و عنایت کی بنا پر خداوند عالم نے انسانوں میں پیغمبر اور نبی بھیجے تاکہ ان کی اس لغزشگاہ حیات میں سعادت کے راستے طے کرنے میں مدد، ماورائے افت محسومات کے مقصد کی طرف رہنمائی کرے اور انسان کی سماجی زندگی میں ضروری قانون کو اس کے لئے فراہم کرے۔ لیکن جب ربانی ہدایت لوگوں تک پہنچا دی گئی اور قانون مدون طور پر ان کے سامنے پیش کر دیا گیا، پھر ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس قانون کو برقرار رکھیں، اس کی توضیح و تشریح و توسعہ کرتے رہیں نیز لوگوں کو مضبوطی سے صراط مستقیم پر باقی رکھیں۔

اللہ کی عنایت و فضل و ہدایت عامہ کے لئے، جس نے نبوت کو انسان کے حوالے کیا، یہ ممکن نہ تھا کہ دوسری ضرورت کو تکمیل کئے بغیر چھوڑ دیتا۔ یہیں سے امامت و ولایت کی ضرورت آشکار ہوتی ہے۔

(ب) الوہی جہان بینی (Divine World-View) کے مطابق اسلام ایک ابدی وغیر فانی دین ہے جو ہر زمانہ میں تمام انسانوں کے لئے معتبر ہے اور ہر قسم کے تاریخی یا اجتماعی روبدل سے بری ہے۔ ایک ایسا دین جو بنیادی اور ثابت قوانین پر بنی ہے، جو تمام شرایط میں قطعیت رکھتا ہے۔ اسلام ابدی اور جاوید ہے۔

اس دعوے کا لازمہ یہ ہے کہ کاروان انسانیت جادہ حیات کے جس مرحلے میں بھی قدم رکھے اور تغیر و ترقی کی جس منزل پر بھی پہنچ جائے اس کے لئے واحد راہ عمل اسلام ہی ہے۔ دوسری جانب یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زمانہ اور انسانی حالات مسلسل تغیر پذیر اور انسانی سماج ہمیشہ فطری انقلابات کی زد پر اور کمال و تکامل کے راستے پر واقع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دین اور فطرت کے بنیادی اصول ہمیشہ ایک جیسے رہتے ہیں لیکن ان اصول کی مطابقت اور ان کے مصدق بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان دو باتوں یعنی دین اسلام کی جادو اور حالات و زمانے کے تغیر و تحول میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے امامت اور غیبت کے زمانے میں ولایت فقیری کا نظریہ پیش کر کے ان دونوں اصول میں ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ چنانچہ ”امامت“، ”ولایت“ اور ”اجتہاد“ یہ تین بنیادی اصول ہیں جو تاریخ کے صفحات میں اسلام کی ہیئتگانی کی خصانت اور توجیہ کرتے ہیں۔

(ج) دوسرے تین وجوہات کی بنا پر بھی امامت کی ضرورت پڑتی ہے:

(۱) اسلامی حکومت کے لئے

(۲) معارف و احکام اسلام کے بیان کے لئے

(۳) انسان کی معنوی سعادت اور باطنی اعمال کی رہبری کے لئے

پیغمبر نے شریعت کو انسانوں تک پہنچایا، لیکن صرف شریعت و نظام الہیہ کا فی نہیں ہے بلکہ اس کو عمل میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر لوگوں کو شریعت الہیہ پر عمل پیرا کرانے پر ایسے افراد مامور کئے جائیں جو خود مشک و شہید میں گرفتار اور نفس کے بندے ہوں تو الوہی معاشرہ

اور اسلامی نظریاتی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جو شخص اسلامی معاشرے کی باگ ڈور سنبھالے، وہ معموم اور مامور من جانب اللہ ہو۔ اسی طرح معارف و احکام اسلامی کی ترویج کا ذمہ دار اسی کو ہونا چاہئے جس کا خمیر روح اسلام سے ہو اور جس کا تعلق خدا سے ہو۔

پیغمبر اسلام کی رسالت محدود نہیں بلکہ ابدی ہے اور تا قیامت رہے گی، مگر ان کی ظاہری زندگی بعثت کے بعد بہت محدود رہی۔ اسی وجہ سے ہر دور کے لئے ایسے فرد کی ضرورت ہے جو پیغمبر تو نہ ہو لیکن پیغمبر سے جدا بھی نہ ہو۔ چنانچہ انہم کی ذوات مقدسہ ایسی ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق کہا گیا ہے: ”اول نام محمد و او سلطاناً محمد و آخر نام محمد“ چنانچہ جو ہر جلوہ کی حیثیت سے یہ لوگ حضرت محمدؐ سے جدا نہیں ہیں۔

ائمهؑ کی خصوصیتیں

ائمهؑ کرام مکمل انسان ہیں۔ وہ انسان جنہوں نے خلافت الہیہ [”إنَّى جَاعِلُ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً“، فتحۃُ الْبَرِّ] اور ”تفَخُّثُ فِيهِ مِنْ رُوحٍ“ [کے تمام امکانات کو عملی جامہ بخششا اور محقق و ثابت کیا ہے، وہ پروردگار کی خاص عنایت سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور مندرجہ ذیل امتیازات کے حامل ہوتے ہیں:]

(۱) عصمت:

گناہ اور غلطی سے محفوظ ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نفس کے تابع ہوتے ہیں اور نہ اپنے کام میں کسی غلطی کے مرتكب ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے برخلاف، جوار تکاب گناہ پر قادر نہ ہونے اور عجز کی وجہ سے گناہ سے محفوظ رہتے ہیں، پیغمبرؐ اور ائمہؑ اپنی طاقت و تسلط، اپنی فکر و نظر اور اپنے ایمان و لیقین کے مراتب کی وجہ سے گناہ، غلطی اور اشتباہ کا ارتکاب نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ”محفوظ“ ہونے کی ان دونوں کیفیتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ”ملک“ اور ”مسجد ملک“ میں فرق ہو سکتا ہے۔

پیغمبرؐ اور امام وجود انسانی کے کمال کی ان بلندیوں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں، جہاں ان کے لئے گناہ اور اشتباہ کا کوئی تصور ہی نہیں رہ جاتا۔ ہم ایک طبیب حاذق کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی مرض کی تشخیص میں کبھی کوئی غلطی کر رہی نہیں سکتا۔ اب یہ ”نه سکنے“ کا لفظ کیا یہ مفہوم رکھتا ہے اسے غلطی پر قدرت نہیں ہے؟ اگر وہ غلطی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا؟ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس فن میں اتنی مہارت اور دسترس رکھتا ہے کہ غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرشتوں کی عصمت اور انبياء کی عصمت میں بھی فرق ہے۔ ایک کا ”(گناہ) نہ کر سکنا“، عاجزی کی وجہ سے ہے اور دوسرے کا ”(گناہ) نہ کر سکنا“، عاجزی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کمال، قدرت اور تسلط کی بنا پر یہ ملکہ

حاصل ہوتا ہے (جو خدا کا خاص لطف ہے)۔ وہ اتنے بلند ہیں کہ ان میں کسی طرح کا نقص سوچا ہی نہیں جاسکتا۔

عقلی نقطہ نظر سے پیغمبرؐ امام کی عصمت کی کیا ضرورت ہے؟

بتایا جا چکا ہے کہ نبوت اور امامت کی بنیاد عنایت، ”فضل“ خداوندی پر ہے، لہذا خدا اپنی عنایت والاطاف کو نبی اور امام کی صورت میں اپنے دین اور شریعت کو عوام تک پہنچاتا اور اس کی تبلیغ اور ترویج کا اہتمام کرتا ہے۔ عقلی نکتہ زگاہ سے لازم ہے کہ ان عنایات والاطاف کے تسلسل کو وہ برقرار بھی رکھے اور پیغمبرؐ امام کو ایسا رکھے کہ ان سے کبھی گناہ یا غلطی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان نہ رہ جائے، ورنہ پوری انسانیت معرض گمراہی اور ضلالت کے دہانے تک پہنچ جائے گی۔ جلوگ خدا کی طرف سے منتخب کر کے ہدایت اور رہبری عوام پر مامور کئے گئے ہیں، اگر وہی غلطی اور گناہ کے مرتكب ہونے لگیں پھر وہ کس طرح اعتماد کے قبل رہ جائیں گے۔ اس طرح عنایت و فضل الہی ناقص سمجھا جانے لگے گا۔ انسانی بلند کرداری اور ایمان اماموں میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ان سے ارتکاب گناہ اور اشتباہ غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ ان کی زگاہوں میں گناہوں کی خرابیاں بالکل واضح ہوتی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح اگر کسی انسان کو یہ معلوم ہو کہ یہ زہر سم قاتل ہے تو وہ اسے نہیں کھاتا۔

(۲) علم وہی:

امام پچونکہ پیغمبرؐ کی طرح براہ راست سرچشمہ نیضان علم الہی سے سیراب ہوتا ہے اور حواس و فکر و اندیشہ کے متابع کے علاوہ دیگر متابع پر بھی دسترس رکھتا ہے اسی وجہ سے، وہ پیدائشی طور پر خصوصی ملکات، خاص قوتیں اور حریت اگنیز استعداد، معنوی اور علم حضوری کا حامل ہوتا ہے۔ جو شخص نور آفتاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسے طلوع آفتاب کی اطلاع کسی اور سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امامت کی اس جہت کو منظر رکھتے ہوئے اگر اماموں میں سے کوئی چھ سال یا

گیارہ سال کی عمر میں عہدہ امامت پر فائز ہو جاتا ہے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ گھوارہ ہی میں نبی تھے اور اسی عالم میں انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان بھی کیا تھا، اسی طرح ائمہ بھی ہیں۔

(۳) بشری پہلو

ان تمام اوصاف علم لدنی و عصمت اور اللہ کی طرف سے رہبری کے باوجود امام بھی پیغمبر ہی کی طرح انسانوں ہی میں سے ہوتا ہے اور تمام اوازم بشریت کا حامل ہوتا ہے۔ (سوائے ان تمام نقص کے جو ناقص بشریت کا نتیجہ ہیں۔) وہ مکلف ہوتا ہے، دوسروں کو جن باتوں کی نصیحت کرتا ہے خود بھی ان پر عمل کرتا ہے۔ دیگر مذاہب کے عرکس اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دین میں کسی وقت بھی انسان کو بلند کر کے خدا یا خدا کی عظمت کو گھٹا کر اسے انسانی سطح پر نہیں لایا جاتا اور اس بات کی تاکید ہے کہ انبیاء و ائمہ قابل انسانی میں روحانی رہبر ہیں، انسانیت سے خارج نہیں ہیں بلکہ حقیقتاً وہ دوسروں کے لئے نمونہ ہیں۔

پیغمبر، امام اور نوائع میں فرق

بعض مغرب زده مسلمان مفکرین کو شش کرتے ہیں کہ پیغمبروں اور اماموں کو "نوائع" کے عنوان سے پیش کریں لیکن یہ ایک زبردست غلطی ہے۔ پیغمبروں اور اماموں کو اس طرح پیش کرنا ان کے روحانی اور الہی پہلو کو نظر انداز کرنا ہے۔ نوائع وہ لوگ ہیں جو قوی عقل و فکر کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طریقے سے کوئی چیز بناتے ہیں، مگر امام اور پیغمبر ان تمام امتیازات سے آراستہ ہونے کے ساتھ ارادہ الہی کی تجلی اور قوی روحانی جنبہ کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ وہ ابدی سرچشمہ الہیہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام پر اس کا نزول نہیں ہوتا۔ مگر وحی کے بیان کرنے اور اس کی توجیہ و تشریع میں وہ خدا کے عطا کئے ہوئے ملکہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نابغہ ہمیشہ خطاطی کی زد پر رہتا ہے، لیکن امام اس سے محفوظ ہوتا ہے۔

لہذا جو لوگ ائمہ اور پیغمبروں کو "عظیم انسان"، والے ترازو پرتو لتے ہیں، درحقیقت ان کی روحانی اور خدائی منزلت کے منکر ہیں۔

رسالت، امامت اور ولادت کا کردار

امام معاشرے میں تین بڑے فریضے اور کردار ادا کرتا ہے:-

(۱) سیاسی وغیر سیاسی رہبری

(۲) معارف اسلامی کی توضیح و تشریع اور دین کا تحفظ

(۳) معنوی رہبری اور باطنی امامت

معاشرہ کی رہبری

(الف) امام کا سب سے بڑا فرض "رہبری" ہے اور ان کے اسی کردار کی مناسبت سے انہیں امام کہتے ہیں۔ امام اللہ سے تقرب کے معنوی راستے کے ذریعے معاشرے کی جانب آتا ہے اور اسے نظام الہی اور جادہ حق کی سست ہدایت کرتا ہے وہ اجتماعی زندگی کو مشیت الہی کے سانچے میں ڈھالتا ہے قوم کی اجتماعی، سیاسی اور دینی رہبری کرتا ہے۔ اسلام میں حکومت اور "کلیسا"، "حکومت" اور "دین" کے درمیان علیحدگی کا وجود نہیں ہے۔ امام دینی پیشووا ہونے کے ساتھ ہی دینیوی رہبر و سربراہ "دین" کے درمیان علیحدگی کا وجود نہیں ہے۔ امام دینی پیشووا ہونے کے ساتھ ہی دینیوی رہبر و سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اسلام میں حکومت نظام الہی کو راجح کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے ولادت و حکومت اسلامی کی زمام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے جو گناہ اور بھول چوک سے منجانب اللہ محفوظ ہوں۔ امام مسلمانوں کا ولی اور حاکم ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: {إِنَّمَا أَوْلَيْكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ أَنْفَلُوا إِلَيْهِنَّ يَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ} (مانہہ: ۵۵) قرآن کی رو سے امام کے احکام کی اطاعت واجب ہے: {أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِ الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ} (نساء: ۵۹)

فقط امام ہی حکومت کرنے کا حقدار ہے۔ اگر امام کو اس کا کردار ادا نہ کرنے دیا جائے تو

اس سے امامت ختم نہیں ہوتی کیونکہ امامت صرف سیاسی اور ظاہری رہبری میں منحصر نہیں ہے، بلکہ حقیقی رہبری، دعوت اور تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور ان تک روحانی فیوض و برکات کا پہنچانا ہے۔ امام قوم سے معنوی اور علمی اتصال کے ذریعہ رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری کو پہلے کی طرح انجام دیتا ہے۔

اسلامی حقائق و معارف کا بیان اور تحفظ

پیغمبر اسلام^ص کے بعد اسلامی معاشرے میں سب سے اہم شے محض سیاسی امور کا چلانا نہیں ہے، بلکہ تعلیمات اسلام اور دینی تہذیب کی تبلیغ اور معارف اسلامی کی توضیح و تشریع بھی ہے۔

اسلامی نظام کو پھیلانے اور اسلامی معارف و نظریات کی تشریع کی ذمہ داری وہی شخص لے سکتا ہے جو خدا کی جانب سے مقرر ہو، خدا کی طرف سے عصمت آب ہو، کیونکہ اگر وہ گناہ یا بھول چوک سے محظوظ نہ ہوگا تو ربانی نظام میں تبدیلی اور تحریف کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ قرآنی آیات اور متواتر احادیث جیسے حدیث تقلین اور حدیث سفیدہ کی رو سے امامت و ولایت اسلامی تہذیب کا سرچشمہ اور علوم و معارف کا مرجع ہے۔ امام حقائق کو بے نقاب ملاحظہ کرتا ہے، وہ اور اک اور علم روحانی رکھتا ہے، دین کے باطنی مفہوم اور وحی کی گہرا یوں کو سمجھتا ہے اور تشریع کرتا ہے۔ (جناب حضرت کی باطنی امامت کا ایک نمونہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے ساتھ تفصیل سے درج ہے: {وَجَعَلْنَا هُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأُوحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْحَيَّاتِ وَإِقَامَةُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ} (انبیاء: ۷۳)

پیغمبرگی بعثت کے ساتھ اسلامی نظام کلی طور پر نازل ہو گیا، لیکن اس کی تشریع و توضیح و حفاظت اور نشر و اشاعت کی ضرورت ہے اور یہ کام امام کے ذمے ہوتا ہے۔ مشیت الہی کے آئینہ دار اور 'الراسخون فی العلم' کے مصدق افراد کے وجود کے بغیر، دین الہی تبدیلی، تحریف، فساد، انحطاط، جمود اور زوال جیسے خطروں کی زدیں ہے۔ ائمہ مکتب اسلام کی جامعیت کے محافظ، اس کے

شارح اور آخری آسمانی پیغام کے جہات، حقیقت اور اس کے اصول کے بچانے والے ہیں۔ اسلام کے وجود کی حفاظت کے لئے ائمہ، شرک، اوہام، جہالت اور انحراف سے نظریاتی فکری جنگ کرتے ہیں تا کہ 'فساؤ (بگاڑ)' کو اسلام کے پیکر سے دور کھیں۔ اہل بیتؑ کے علمی مرجعیت کے آگے سرتسلیم خم نہ کرنا مسلمانوں کی بُنصبی ہے، جس نے بنی امیہ اور بنی عباس، یونان زدگی، اسرائیلیات، التقاطی فکروں، مشرق پرستی اور مغرب زدہ پرستی اور یلغاری فکروں کو جہاں اسلام کے طرز فکر پر مسلط کر دیا اور اسلام پر کاری ضرب لگائی، لیکن اس کے باوجود ہزاروں حدیثوں کی برکت اور اماموں کے علمی مدارس کا فیض تھا کہ اسلام، خدا کے عطا کردہ اصلی خود خال ساتھ تاریخ میں موجود ہے اور گذشتہ تحریف شدہ ادیان کے مقدار سے دوچار نہیں ہوا۔

(ج) امامت کی باطنی رہنمائی

امام کے کردار کو صرف سیاسی و سماجی رہبری حتیٰ کہ علمی کردار میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ دنیا والوں کے لئے فیض ربانی کا وسیلہ بھی ہے۔ امام باطن میں بھی رہبری کے عہدے کا حامل ہے اور خدا کی طرف انسانوں کی باطنی رہبری بھی کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی وجود صرف مادی، سماجی اور فکری پہلووں میں محدود نہیں ہے، بلکہ وجود کی ظاہری سطح کے نیچے روح کی تجرب خیز گہرا یاں ہیں۔ ظاہری زندگی سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جس کے نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہو اسمندر موجود ہوتا ہے مگر ہم ان سے بے خبر بالائی سطح پر ہی ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو باطنی تزکیہ اور روحانی مقامات تک پہنچ چکے ہیں ان رموز سے واقف ہیں۔ امام ان مقامات پر بھی فیض ربانی کے وسیلے کی حیثیت سے نور بر ساتا اور انسانوں کی ہدایت کرتا ہے۔ بقول علامہ طباطبائی: (انسان فہمد یا فہمہ درست مانند کو دی است کہ تخت تربیت قرار می گیرد) ^(۱) انسان سمجھے یا نہ سمجھے وہ ایک بچکی مانند ہے جس کی تربیت کی جا رہی ہے۔ "امام کے ان باطنی رخوں پر غور کر کے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ زمانہ غیبت میں امام کس طرح ہدایت کے فرائض انجام دیتا ہے۔

(۱) شیعہ در اسلام، حصہ ۲۵۶ / انبیاء: ۷۳

زندگی کے ہر دور میں ایک ایسے انسان کامل کی ضرورت ہے جو ولایت کی حقیقت کا حامل اور مخلوقات کے لئے فیضانِ الہی کا ذریعہ ہو۔ دنیا ان ہی کامل انسانوں کے دم سے قائم ہے۔ حدیث قدسی میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے جو کہا گیا ہے: ”لَوْلَا كَلَمًا خَلَقْتُ الْأَفْلَاجُ“^(۱) (اگر آپ نہ ہوتے تو ہم زمین اور آسمان کو پیدا نہ کرتے) اس کا اشارہ حقیقت کی اسی گھرائی کی طرف ہے۔

کیوں ”امام“ یا ”ولی“ سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہنا چاہئے؟

اس طرح کوئی بھی دور، عنایتِ الہی کے ذرائع، معنوی نورانیت اور انسان کامل کے مصداق، ان ہستیوں سے کبھی خالی نہیں رہ سکتا، اسی وجہ سے انسانی معاشرہ انجمن کے وجود سے کبھی بھی خالی نہیں رہ سکتا۔ ”لَا تخلو الارض عن حجۃ اللہ“ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جو نظام عقائد و اعمال انسانوں کے لئے مہیا کیا ہے، وہ اور اسلام کے اصول و شریعت، باطنی حقائق اور روحاں کیڑیوں پر استوار ہیں۔ آج کے فلسفہ کی اصطلاح میں ہر قانون یا غالباً ہری اصول کے پہلو میں ایک جو ہر اور باطنی اساس موجود ہوتی ہے۔ نتیجتاً ہر زمانہ میں اسلام کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو باطنی پہلوؤں کو سمجھتے ہوں اور اس عالم کی سیر کرتے ہوں اور باطنی حقائق کا براہ راست مشاہدہ کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق زمانہ غیبت امام عصر میں (فقیہ) علم و مراجع دینی کی باطنی طور پر رہنمائی فرماتے ہیں۔

تیسرا بات یہ ہے کہ جو ذمہ داری انبیاء کے حوالے کی گئی ہے وہ ممکن ہے کہ ابلاغ کے ذریعے مکمل ہو جائے، لیکن انسانوں میں اس پیغام کی حفاظت کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ چنانچہ زمانہ غیبت میں نیابت امام کی یہ ذمہ داری مجتہدین اور صاحبِ نظر و کردار فقہا پر عائد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ”ولی فقیہ“ اس منصب پر فائز ہوتا ہے۔

(۱) حدیث میں آیا ہے: ”يَتَفَعَّلُونَ بِوَلَايَتِهِ فِي غِيَّبَتِهِ كَالنِّتَّفَاعُ النَّاسُ بِالشَّمْسِ وَانْتِجَلَلُهَا سَحَابٌ۔“ (کمال الدین، دوسری ایڈیشن، ص: ۲۵۳)

زمانہ غیبت میں ولایت امامت

کیا زمانہ غیبت میں ولایت و رہبری کا سلسلہ کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور قوم اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی ہے اور کسی طرح کی ہدایت و رہبری کی ضرورت نہیں رہتی ہے؟ ایسا نہیں ہے، نہ ہی ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل کی رو سے رہبری، امت کو شکل دینے نظم و نسق اور حکومتِ اسلامی بنانے کی ضرورت ختم نہیں ہو سکتی اور ہر زمانے میں فویت کی حامل ہے۔

(۱) کسی معاشرہ کا وجود ہدایت، رہبری اور حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس حکومت کی بنیاد حق و صداقت پر مبنی ہو خواہ ظلم واستبداد پر^(۱) اسلام بھی جو ایک جامع و مانع نظام ہے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ معاشرے پر ظالم اور ستمگر حکومت کا تسلط ہو جائے۔ امام معصوم کی غیبت اس ضرورت کو ختم نہیں کرتی ہے۔

(۲) شریعت اسلام کا سلسلہ کسی زمانے میں بھی منقطع نہیں ہوتا۔ فتنہ اسلامی اور قوانینِ قرآنی کے موضوعات پر ایک طائر ان نظریہ ثابت کرتی ہے کہ غیبت امام کے زمانہ میں بغیر ایک رہبر کے وجود کے ان میں سے بہت سے دستور و قوانین کا نفاد ممکن نہیں ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ غیبت کے زمانے میں احکام شریعت اور قرآن کا $\frac{۲}{۳}$ مיעطل ہو جائے؟ مثلاً قرآن اور شریعت اسلام مالیاتی قوانین مثلاً افال، خمس، زکوٰۃ، بخربز میں، خراج (مفتوحہ زمینوں کا ٹیکس) احکام ذمی، مسلم، احکام دفاع طاقت کی آمادگی اور تدارک کا حصول، اسلام کا دفاع، حدود اسلامی کا تحفظ، مسلمانوں کے خون اور ناموس کی حفاظت اور ظالم کے مقابلے میں مظلوموں کی حمایت وغیرہ قوانین کا حامل ہے۔^(۲) اسی طرح قرآن اور فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ احکام جہاد، صلح، احکام قضاء، قصاص اور حدود و دیات پر مشتمل ہے۔

(۱) امیر المؤمنین نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: وَإِنَّهُ لَا يَدْلِلُ النَّاسَ... فِيهَا الشَّفْقَى۔ (فتح البالغ، خطبہ: ۲۰)

(۲) وَاعْدُوا لَهُمْ... وَعْدَنَا

بغیر اسلامی حکومت کے وجود اور رہبری کے تمام تر تعلیمات اسلام کی ترویج کس طرح ممکن ہے؟ اسلام ایک کامل دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور بقول بانی جمہور اسلامی آیت اللہ خمینی ”اسلام نے انسان کے لئے انعقادِ نطفہ کے پہلے سے موت کے بعد تک کے قوانین بنادئے ہیں۔ جس طرح عبادت کے قوانین ہیں، اسی طرح اجتماعی قوانین بھی موجود ہیں“^(۱) لہذا ہر دور میں چاہئے کہ اجتماعی، اقتصادی، عدالتی اور سیاسی حکومت و نظام اپنے خاصہ کو برقرار رکھے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ غیبت کے زمانے میں بھی رہبری اور ولایت کی ضرورت بد رجاء تم باقی رہتی ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام معصوم کے بعد مسلمانوں کی دینی اور دنیوی رہنمائی اور مرعیت کیسی ہوا رزماں رہبری کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو؟ بے شمار نقی اور عقلی دلائل کی رو سے غیبت کے زمانے میں اس رہبری کی ذمہ داری واقف ترین اور صاحب ترین علماء فقہا پر آتی ہے۔

احادیث و اقوال پیغمبر و ائمہ کی رو سے علماء اور مستند صحابا و ائش و بیش کو مخالفین دین، وارثان انبیاء اور جانشینان پیغمبر کے عنوان سے پہچنوا یا گیا ہے۔ ذیل میں اس طرح کی چند حدیثوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

نقلي وليلين:

پیغمبر سے منقول ہے: ”اللهم ارحم خلفاء ثلاث مرت قيل يا رسول الله ومن خلفائهم؟ قال: الذين يأتون بعدي يرونون حديثي و سنتي ثم يعلمونها“^(۲) اس حدیث میں پیغمبر نے سنت و حدیث کے ماہرین اور دین کے دانشواروں کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ دوسرا جگہ پیغمبر کا ارشاد ہے: ”الفقهاء امناء الرسول مالم يدخلوا في الدنيا قيل يا رسول الله ما دخلوهم في الدنيا، قال اتباع السلطان فإذا فعلوا ذلك ما حذروهم“

(۱) ”ولاية فقيه“ امام خمینی، ص ۱۰

(۲) وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۲۵

علی دینکم“^(۱) یعنی فقہاء پیغمبروں کے امین ہیں جب تک کہ دنیا کے آگے سرخہ خم کریں۔ پوچھا کہ دنیا کے آگے سرخہ کا نے کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ظالم اور غیر اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا اور اگر وہ ان کاموں کو انجام دیتے ہیں تو ایسے علماء سے پرہیز کرنا چاہئے۔

امام زمانؑ نے اسحاق ابن یعقوب کے پوچھئے ہوئے چند مسائل کے جواب میں فرمایا: ”اما الحوادث الواقعه فارجعوا فيها الى رواة احاديثنا وفانهم حجتى عليكم وانا حججه اللہ علیہم“^(۲) [اپنے روزمرہ کے مسائل اور روئیداد کے متعلق میری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو (جو اسلامی کتابوں پر گھری نظر رکھتے ہیں) کیونکہ تمہارے لئے وہ میری طرف سے مستند ہیں اور ان کے لئے میں خدا کی طرف سے مستند ہوں] یہ حدیث بھی ظاہر کرتی ہے غیبت کے زمانے میں مستند بال بصیرت دانشور اور مجتهدین ہر قسم کے مسائل میں مسلمانوں کی رہبری کا استحقاق رکھتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام نے بھی فرمایا ”اخذ اللہ علی العلماء ان لا يقارو على ظلم طالم ولا سغب مظلوم“^(۳) یعنی تبلیغ کی ذمہ داری، نظام اسلام کی حفاظت ظالم سے جنگ اور مظلوم کی حمایت مستند، صاحبان کردار و بینیش علماء کے فرائض میں داخل ہیں۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ”ان العلماء ورثة الانبياء“^(۴) یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

”منزلة الفقيه في هذا الوقت كمنزلة الانبياء في بنى اسرائيل“^(۵) یعنی زمانہ غیبت میں فقہاء کا مقام بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہے۔

”ومن كان منكم قدروى حديثا ونظر فى حلالنا وحرامنا وعرف احكاما نا“ فلیو منوا به حکماء وعلینا ردو الرد علینا الراد علی الله وهو علی حد

(۱) کافی، ج ۱ ص ۳۶: ان روایات کی بحث اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ”ولاية فقيه امام خمینی،

(۲) کمال الدین، مصدق، ج ۳ ص ۳۸۳-۳۸۴ (۳) نجی الباغی

(۴) اصول کافی، ج ۱ ص ۱۸۲، حدیث

الشَّرِكُ بِاللَّهِ^(۱)، یعنی تم میں سے جو داشتمند مسائل اسلامی اور میری حدیثوں کا درک رکھتا ہوا اور احکام اسلام میں اجتہاد کا حامل ہو اس کے حکم کے آگے سر جھکاؤ، ہم نے اسے تم پر ولی اور حاکم بنایا ہے، پس اگر ایسا فرد کوئی حکم دیتا ہے اور کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے سرتاسری کا مرکتب ہوتا ہے اور ہمیں رد کرتا ہے پس جو ہمیں رد کرے وہ دین خدا کو رد کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہوتا ہے۔“

ان مستند احادیث و روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”ولایت فقیہ“ ناقابل تردید ہے اور غیبت امام کے زمانے میں مسلمانوں کی رہبری کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور اسلامی حکومت کا قیام، مکتب اسلام کی حفاظت اور ظلم و ظالموں سے مقابلہ کی ذمہ داری ختم ہونے والی نہیں ہے۔

ولایت فقیہ کا فلسفہ

عقل نقل نظر سے ولایت فقیہ کا فلسفہ سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے:

دنیا میں مختلف طرز حکومت اور نظام رائج ہیں۔ استبدادی حکومت میں طاقت پر ایک فرد کا قبضہ ہوتا ہے۔ سلطنتی نظام میں شاہ کو (ظل الہی) سمجھا جاتا ہے اور عوام اس کے لئے الہی حق کے قائل ہوتے ہیں۔ اشرافیہ (Aristocracy) حکومت میں طبقہ اشراف حکمران ہوتا ہے۔ جمہوری (Democratic) طرز حکومت میں عوامی طرز کی ہوتی ہے۔ صرف عوام کی رائے ہی حاکم اور کرتا دھرتی ہوتی ہے۔ (البتہ سرمایہ بد اراثہ نظام میں دولت اور فریب کی حکمرانی ہوتی ہے)۔ عیسائی معاشرے میں کلیسا کی حکمرانی ہے۔ ان تمام سیاسی نظاموں کے مقابلے میں اسلام نے شرعی حکومت پیش کی ہے، اس لئے ہم اسلامی نظام کو ایسے قانونی یا دستوری حکومت کا نام دے سکتے ہیں جس میں صرف قانون شریعت اور ارادہ الہی حاکم ہے یہاں تک کہ پیغمبر اور امام بھی اسی کے تابع ہیں۔

(۱) عوائد نزاتی، ص ۱۸۶

جہوریت میں عوامی نمائندے حاکم ہوتے ہیں، اشرفت میں طبقہ اشراف کے نمائندے حکمران ہوتے ہیں۔ کلیساً حکومت میں کلیسا، پوپ اور بشف وغیرہ کی فرمازوائی ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قانونی اور دینی حکومت میں کن لوگوں کی حاکمیت ہونا چاہئے؟ جواب ظاہر ہے۔ اس نظام حکومت میں حکومت کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے جو اس قانون اور اس نظریہ کے خصوصی ماہر اور اس دین و مذهب کے مستند انشمند ہوں۔ یہی عقلی اور منطقی فیصلہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غیبت کے زمانے میں بھی اسلامی معاشرے میں ”ولایت“ اور ”رہبری“ کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور مستند و صاحب فکر و کردار علماء، اماموں کی تہذیب کے وارث، حکومت اسلامی اور حق و باطل کے جنگ کے علم بردار ہیں۔ امت اسلامی پرواجب ہے کہ ان کی اطاعت کرے اور ان کے پرچم کے تلنے بکجا ہو کر اسلام مخالف قوتوں کے خلاف بے جگہی سے نبرد آزمائہ اور ساری دنیا میں اسلامی حاکمیت کا جھنڈا گاڑ دیں۔

حیاتِ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام

-حضرت علیؑ: ایک ہمه جہت

(بہو مُخُبُّی/Multidimensional) خصیت

اسلام ایک ہمه جہت اور توحیدی دین ہے۔ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو دین و دنیا، روحانیت و مادیت، جسم و روح، معاش و معاد، مذہب و سیاست اور عرفان و انقلاب کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ اس میں 'عرفان' بھی ہے اور عدالت و آزادی بھی، عبادتی پہلو بھی ہے اور سیاسی و اجتماعی و اقتصادی و تکنیکی پہلو بھی۔ اسلامی نقطہ نظر سے مثالی انسان وہ انسان ہے جو ہمه جہت ہونے کے لئے مدد و مدد میں مددود ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ہمه جہت انسان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ وہ اسلام اور توحیدی بصیرت کی سچی تصویر ہیں۔ انہوں نے دینِ محمدی کی جامعیت کے مجزہ کو اپنے حیات میں بڑے محسوس کئے جانے والے انداز میں پیش کیا ہے۔ علیؑ مذہب و سیاست کے مالک ہیں، عرفان، انقلاب، محراب، میدان جہاد، شمشیر، قلم اور منبر کے آدمی ہیں۔ وہ عرفان، عدالت اور آزادی کا مجسمہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر شریعت..... "علیؑ میں سب سے زیادہ نمایاں ان کی ہمه جہت، روح ہے، ایسی روح جو مختلف پہلوؤں حتیٰ کہ متصاد پہلوؤں کے لحاظ سے سورما (Hero) ہے۔ وہ طرز فکر، جنگ، عشق، محраб، انسانیت، عرفان اور سیاست کے ہیر و اور ان تمام پہلوؤں اور انسانیت کے دلوں میں پل رہی برائیوں کے سخت دشمن تھے، جنہوں نے انسانیت کو دکھ اور درد میں بیتلہ کر رکھا ہے۔ ان کا دل اقدار انسانیت سے مملو رہا۔"^(۱)

علیؑ ہمه جہت روحانی حیثیت کے حامل ہیں۔ ایک جانب تدوہ عرفان کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں، عارفوں کے امام اور اہلِ باطن کے قطب الاقطب ہیں۔ دنیاۓ اسلام میں تصوف و عرفان کا کوئی سلسلہ نہیں ہے جس کی انتہائی پر نہ ہو؛ دوسری جانب وہ ایک بڑے عدل پسند ہیں۔ دنیا کے ہر انقلابی سے بڑھ کے انقلابی ہیں۔ عرفان کی معراج کمال تک پہنچنے کے بعد بھی سماجی مشکلات نیز کمزوروں کے سلسلے میں حساس ہیں۔ اگر علیؑ ایک طرف اسلام میں مشائے عرفان ہیں تو دوسری طرف ان کی تمام زندگی جہاد، معرکہ آرائی اور نبرد آزمائی سے بھری ہوئی ہے۔

میدان عمل کے ہر معرکہ کے ایسے بے مثال مجاہد اور صاحب ذوالفقار ہیں، ساتھ ہی ساتھ کشو علم میں ایسی بلندی پر فائز ہیں کہ پیغمبرؐ انھیں باب شہر علم، کا قلب عطا کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ اپنے مشہور و معروف خطبہ شقائقیہ میں خود فرماتے ہیں: "يَنْهَا حَدِيرَةُ السَّيْلِ وَ لَا يَزْقَى إِلَيَّ الظَّيْرُ" یعنی میرے وجود کے کوہ سارے فہم و دانش کے چشمے ابتدے ہیں اور کوئی پر نہ میری ہستی کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

وہ گھری نظر کے صاحب حکمت ہیں، ایک شعلہ بیان خطیب ہیں، علیؑ ایک لاکن سیاست داں اور عظیم مملکتِ اسلامی کے فرمانرواؤ ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک محنت کرنے والے مزدور ہیں جو کھیتوں میں سیچائی اور کنوں کھونے کا کام کرتے ہیں۔ وہ ایک بہادر کمانڈر اور مضبوط سپاہی ہیں۔ کافروں کا کوئی خاندان ایسا نہیں جس نے ان کے آب دم شمشیر کا مزہ نہ چکھا ہو۔ اس کے باوجود ایک مہربان سرپرست اور نرم دل کے مالک ہیں۔ ایسے نرم دل کہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر اشکبار ہو جائیں۔ اگر دن کے وقت پیشہ شجاعت کے شیر ہیں تو رات کے وقت ایک عابد شب زندہ دار۔ میدان جنگ میں شیر کی طرح ہیں تو رات کو محراب عبادت میں جسم پر رعشہ اور آنکھیں اشکبار ہیں، ایک سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر متعصب قاضی بھی ہیں۔

علیؑ اسلام کے ہر رخ کی مکمل تصویر ہیں۔ حامل کتاب بھی ہیں (یعنی علم و حکمت میں "التراسخون فی العلم")، میزان (عدالت) بھی اور آہن (شمشیر) بھی۔ علیؑ پیکر عرفان ہیں،

(۱) مجموعہ آثار، شمارہ ۹ ص ۶

محمدہ عدالت ہیں، آزادی کے محافظ ہیں۔ ان کی شمشیرخون کے دریا بہاتی ہے اور ان کے دل سے محبت کے چشمے ابتنے ہیں۔ ظالم و جابر کے مقابلے میں طوفان کی حیثیت رکھتے ہیں اور مظلوم کے لئے پنگھڑی کی طرح نازک ہیں۔

امیر المؤمنینؑ مجموع صفاتِ کمال بھی ہیں اور جامعِ اضداد بھی۔ تمام اتوام و مل میں جتنی بھی تاریخی شخصیتیں گزری ہیں ان کے کمال اور صلاحیتیں مختلف میدانوں میں اجاگر ہوئی ہیں یعنی جو فکر میں یکتاںے روزگار تھے وہ صاحبِ شمشیر نہ تھے، جو عظیم فرمائز و اتحاد و عاقبتِ اندیش نہ تھے، معروف حکماء اہلِ حکم نہ تھے، اور جنہیں جستیِ سخن میراث ہی ان کے تفکر میں گھرائی نہ تھی مگر ان کے برعکس علیؑ کی شخصیت ہر رخ سے تباہ نظر آتی ہے۔

قرآن حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوت کا مجذہ ہے اور علیؑ ان کی آغوش کا مجذہ ہیں۔ علیؑ پیغمبرؐ اور اسلام کی حقانیت کے ایک عظیم شاہد ہیں اور ایسے جامع کمالات ہو کر علیؑ اعلان کرتے ہیں ”آنا عبدِ منْ عَزِيزٍ دُهْمَدٍ“ یعنی میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔

-۲- حضرت علیؑ کے ادوار زندگی کی تقسیم

جیسا کہ بعض معاصر اسلامی مفکرین نے اشارہ کیا ہے امیر المؤمنینؑ کی زندگی کو تین ادوار پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور: بچپن سے وفات پیغمبر تک، یہ دور انقلابِ اسلامی کی فتح کے لئے جہاد اور دین کی تکمیل پر مشتمل ہے۔

دوسرਾ دور: وفات پیغمبر سے قبول خلافت تک، یہ دور مسلمانوں کے اتحاد اور اسلام کی حفاظت کے لئے ۲۵ سال کی خاموشی کے طویل وقہ پر مشتمل ہے۔

تیسرا دور: قبول خلافت سے شہادت تک، یہ دور پانچ سال کا ہے اور قیامِ عدالت اور نظامِ اسلام کو قائم اور جاری رکھنے کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔

پہلا دور علیؑ پیغمبرؐ کے ساتھ

حضرت علیؑ بچپن سے احمد میں پیغمبرگی وفات تک جس میں دور بعثت کے ۲۳ سال تک شامل ہے، پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ رہے۔ وہ پیغمبر اسلامؐ کے دستِ راست، ان کے وزیر، وصی، مشیر اور یا ورنہ ناصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ صلح ہو یا جنگ، رزم ہو یا بزم، علیؑ ہر آن پیغمبر اسلام کے ساتھ تھے اور پیغمبرؐ کے اصحاب میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ شیعہ، سنی، جعفری، زیدی، خبلی، حنفی، مالکی اور شافعی تمام حدیثی اور تاریخی ذرائع نے مذکورہ آزمائشی دور میں متفقہ طور پر حضرت علیؑ کے امتیازات، ان کی جاں ثاریوں اور عظیم کارناموں کو بیان کیا ہے۔ علیؑ قیامِ دین کے لئے ہمیشہ سربکف میدان میں آئے ہیں۔

مندرجہ ذیل صفات میں حضرت علیؑ کے کارہائے نمایاں، امتیازات، بلندی اور فضائل کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔ اس وقت کا جائزہ جب دین اپنے ابتدائی مرحل میں تھا، امت مسٹکم نہ تھی اور دین الہی کا پھیلانے والا ابھی موجود تھا۔ ہلسنت کے معتبر ترین منابع و مأخذ سے ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت علیؑ کی تحفظِ دین اور قیامِ مذہب کے لئے تمام کاوشوں اور کارہائے نمایاں کے سلسلے میں مسلمانوں کے کسی فرقہ میں کوئی اختلاف نہ تھا اور سب اس مسئلہ پر متفق الرائے تھے کہ علیؑ کی زندگی کا پہلا دور جو ۲۳ سال پر مشتمل ہے، دین کے قیام اور اس کے دفاع میں گزارا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ یہ حصہ آیت اللہ سید علی نقی نقوی صاحب کی اس مفصل تحقیق کا نچوڑ ہے جو پاکستان میں ”خلافت و امامت“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔

علیؑ نے اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت حاصل کی

تاریخی تحقیق میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میدان میں کس کو برتری حاصل ہے۔

عقل و منطق (Logic) کے اعتبار سے بھی یہ بات زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ بعثت کے بعد اپنے گھر اور اپنے خاندان سے تبلیغ کا کام شروع کرتے ہیں اور پیغمبرؐ سے زیادہ قریب لوگوں میں ان کے گھر کے حضرت خدیجؓ اور حضرت علیؓ تھے۔
تاریخی نکتہ نظر نیز اسلامی کتابوں کے ابتدائی مأخذ (Sources) اور علماء اہل سنت کی تمام کتابوں کو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے جس نے اپنے اسلام کا اعلان کیا وہ امیر المؤمنینؑ تھے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر اپنی کتاب ”تقریب التہذیب“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”الْمَرْجَحُ أَنَّهَا أَوَّلٌ مَّنْ آتَيْلَمْ“ (ص/۸۲، مطبوعہ دہلی) اس نظریہ کو ترجیح حاصل ہے کہ سب سے پہلے جو اسلام لایا وہ علیؓ تھے۔

مذکورہ کتاب کے ”باب الالقاب“ سے ظاہر ہے کہ اسلام قبول کرنے میں علیؓ کی سبقت اس قدر مشہور تھی کہ آپ کا لقب ہی ”سابق العرب“ (عربوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والا) ہو گیا تھا۔^(۱)
تاریخ اور حدیث کی اہم کتابوں میں موجود مختلف واقعہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک عفیف کندی کی روایت بھی ہے۔

عفیف کہتے ہیں کہ میں ایک تاجر تھا۔ جب جج کو گیا تو عباس ابن عبدالمطلب سے ملاقات کرنے کے لئے گیا۔ ایک دن ان کے پاس موجود تھا، میں نے ناگاہ دیکھا کہ ایک شخص پرده کے باہر آیا اور مخصوص عبادت میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پرڈے سے باہر آئیں اور وہ بھی ان کی اقتداء میں عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے عباس سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ”یہ محمدؐ ابن عبد اللہ ہیں۔“ پھر میں نے ان سے سوال کیا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ان کی بیوی خدیجؓ ہیں۔

پھر ہوڑی دیر کے بعد ایک بچہ برآمد ہوا اور وہ بھی آکر ان کے ساتھ عبادت کرنے لگا۔

(۱) تقریب التہذیب، ص ۳۲۱

میں نے عباس سے پوچھا کہ یہ بچہ کون ہے؟ عباس نے جواب دیا یہ محمدؐ کے پچازاد بھائی علیؓ ہیں۔
میں نے پوچھایا لوگ کیا کر رہے ہیں۔ عباس نے کہا: ”یہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ محمدؐ کا خیال ہے کہ خدا نے ان کو پیغمبر بنایا ہے۔ ابھی تک ان کی بیوی اور ان کے پچازاد بھائی علیؓ کے علاوہ کسی نے ان کے اس دعوے کو قبول نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود ”محمدؐ“ کا خیال یہ ہے کہ وہ قیصر دکری کے ملکوں کو فتح کر لیں گے۔“ عفیف اس واقعہ کے بعد اکثر کہرتے ہیں ”لَوْ كَانَ رَزْقَنِي الْإِسْلَامَ يَوْمَ مَؤْمِنٍ كُنْتُ ثَانِيًّا مَعَ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ“۔ اگر میں اس دن اسلام لاسکا ہوتا تو علیؓ کے بعد دوسرا شخص میں ہی ہوتا۔

اس روایت کو ابن اسحاق نے ”سیرۃ“ میں، نسائی نے ”مسند“ میں، ابن عبد البر قرطبی نے ”استیعاب“ (ص ۲۲۵، مطبوعہ حیدر آباد) میں، ابن اشیر جزری نے ”اسد الغابة“ (ج ۳ ص ۷، مطبوعہ مصر) میں اور ابن اشیر نے ”کامل“ (ج ۲ ص ۳) میں لکھا ہے۔

البترة بخاری نے اپنی ”صحیح“ میں دو ایسی روایتیں درج کی ہیں جن کی رو سے علیؓ چوتھے یا نویں شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ لیکن بخاری کی یہ دونوں روایتیں ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں، کیوں کہ ان دونوں روایتوں کا راوی اسماعیل ابن مجاهد ہے۔ یہ ضعیف، سقیم اور غیر معتر ب ہیں۔ ان میں سے ایک عفیف کندی کی روایت بھی ہے۔

حاکم کا بیان ہے کہ یہ غیر معتر ب ہے۔ سعدی نے کہا ہے کہ ”یہ شخص تعریف کے قابل نہیں ہے“، ابوذر عکتہ ہیں کہ ”عقیدہ کے اعتبار سے اس کا کوئی بھروسہ نہ تھا“، دارقطنی نے تصریح کی ہے کہ ”اسماعیل ابن مجاهد کے ضعیف اور غیر معتر ہونے پر اجماع ہے۔“

مذکورہ روایت فتنی اعتبار سے بھی علم درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ اس کے علاوہ یہ احادیث بھی کم تر درج کی روایت ہے۔

عقل بھی اس روایت سے انکار کرتی ہے، اس لئے کہ قریبی افراد جیسے حضرت خدیجؓ،

مند احمد ابن حنبل، سیرة ابن اسحاق، خصائص نسائي، تاریخ طبری، تاریخ ابو الفداء

حضرت علیؑ (جب کہ ابوطالبؑ کی وفات کے بعد پیغمبر ﷺ کے مرتبی تھے) اسلام کے حلقة بگوش نہ ہوں اور غلاموں میں سے پانچ افراد جن کا نام بھی لوگ نہیں جانتے تھے، وہ سلمان ہو جائیں !!!
اس احادیث ضعیف اور ناقابل قبول روایت کے مقابل میں ایسی روایتیں کثرت سے ملتی ہیں
جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضرت خدیجؓ کے بعد حضرت علیؑ سب سے پہلے شخص تھے جو اسلام لائے۔
تاریخ وحدیت کی ابتدائی کتابوں کو دیکھنے کے بعد علیؑ کے سابق الایمان ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ خود پیغمبرؐ سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”علیؑ پہلے شخص ہیں جو ہم پر ایمان لائے“۔ اس روایت کو احمد نے عمر سے، طبرانی نے سلمان سے، عقیل نے براء ابن عاذب سے اور دوسرا جگہ احمد و طبرانی نے معتن بن یسار سے، دارقطنی نے ابوسعید خدری سے، دیلیمی نے سعد، ابوسعید امام سلمہ، جابر اور اسماء بنت عمیس سے، حاکم نے معاذ سے، عقیل نے عائشہ سے، ابن اسامہ نے سلمان سے اور ابوالنعیم نے معاذ سے نقل کیا ہے۔

علیٰ کی پہلی فضیلت (ایمان کے اعلان میں سبقت) اس وقت ظاہر ہوئی جب پنجابر اسلام

ج ۲/ص ۱۱۶، مطبوعہ مصر، کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۱۲۲، تہذیب الآثار طبری، دلائل بیهقی، تاریخ خمیس، تفاسیر ابن مردویہ، واحدی اور ابی حاتم امام بخاری نے تھسب اور بے جا طرف داری کی بنابر {وَأَنْذِرْ عَشِيرَةَ الْأَقْرَبِينَ} کے شمن میں جس داستان کو بیان کیا ہے وہ صفات اول کے تمام محدثین و مورخین کے بیان کئے واقعہ کے غلاف ہے۔ بخاری نے جس داستان کو نقل کیا ہے اس میں انہوں نے دعوت کا تذکرہ، پیغمبرؐ کی باتیں اور علیؐ کا جواب سب حذف کر دیا ہے اور بڑی ہوشیاری سے اس کی جگہ قبیلہ بنی فہر، بنی لوئی اور بنی عدی کی نسبت صحیح و انداز کو داخل کر دیا ہے۔

لیکن علم، تحقیق اور درایت کے اعتبار سے بخاری کی روایتیں ناقابل قبول اور غیر معتر ہیں۔ بخاری کی دونوں روایتوں کے اصل راوی ابن عباس ہیں جو تمام مورخین کے بیان کے مطابق ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور دعوت ذوالعشیرہ کا واقعہ ابن عباس کی ولادت سے سات سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آیہ {وَأَنْذِرْ عَشِيرَةَ الْأَقْرَبِينَ} کے ذیل میں جو تیسرا واقعہ بخاری نے نقل کیا ہے وہ ابوہریرہ سے مردی ہے اور ابوہریرہ کے بارے میں تمام مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ~~کے~~ ہم میں جنگ خیر کے دوران مسلمان ہوئے اور اس وقت بچے تھے۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابوہریرہ ”دعوت ذوالعشیرہ“ کے موقع پر دو تین سال سے زیادہ کئی نہیں تھے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری نے اپنے ایک راوی کو ولادت کے سات سال پہلے اور دوسرے کو دو یا تین سال کی عمر میں واقعہ نقل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ ایک راوی اپنی بیان کی ہوئی روایت کے سات سال بعد پیدا ہوا ہے اور دوسرے راوی واقعہ کے وقت محض دو یا تین سال کا ہے اور اس واقعہ کے تقریباً چودہ سال بعد راوی مسلمان ہوتا ہے !!!

بخاری دعوت ذوالعشیرہ کے سلسلہ میں ایسے اکٹھے کہ واقعہ ذوالعشیرہ کو نقل ہونے سے روکنے کے لئے دوسری بڑی تاریخی غلطی کر بیٹھے۔ انہوں نے حقیقی واقعہ سے گریز کرنے کے لئے آیہ {وَأَنْذِرْ عَشِيرَةَ الْأَقْرَبِينَ} کے ذیل میں داستان ابوالہب، قصہ کوہ صفا اور نزول آیہ

{تَبَثَّ يَدَا أَبِي لَهَبٍ} کو درج کر دیا ہے مگر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ ان دو آیتوں کے ذیل میں گذرنے والے واقعات کا ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ کوہ صفا کا واقعہ دعوت ذوالعشیرہ کے تین سال بعد کی بات ہے۔ یہاں بخاری سے اتنی بڑی غلطی ہوئی ہے کہ خود ان کے ارادتمندوں جیسے ابن خزیمہ اور اسماعیلی کو بھی سخت حرمت اور تعجب ہے۔ ان کے عقیدتمند بھی اس سلسلے میں بخاری کو غلط ٹھہرانے پر مجبور ہیں۔ دعوت ذوالعشیرہ کا واقعہ اول اسلام کا واقعہ ہے۔ اس وقت نہ تو ابن عباس پیدا ہوئے تھے اور نہ ابوہریرہ کا کہیں اتنا پتہ تھا۔ ابوالہب کے واقعہ اور قصہ کوہ صفا کو اس آیت سے کوئی ربط نہیں ہے۔

واقعہ ہجرت پر ایک تحقیق

دعوت ذوالعشیرہ کے بعد جب پیغمبرؐ نے اعلانیہ طور پر اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو کفار مکہ سے پہنچنے والی اذیتیں اور بڑھ گئیں اور پیغمبرؐ کے قتل کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو مجبوراً جبشہ کی جانب ہجرت کرنا پڑی۔ قبائل عرب کے بعض افراد نے یہ ٹھان لی کہ پیغمبرؐ کے گھر کا حصارہ کر کے ان کو قتل کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسے بحرانی دور میں کسی کی نصرت اور مدد کرنا کتنا دشوار ہے۔ پیغمبرؐ کرم جانتے تھے کہ ایسے جان لیو اور نازک وقت میں کون جان بازی کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس بنا پر آپ نے مکار دشمنوں کی سازشوں کو ناکام کرنے کے لئے، بے جھگج پوشیدہ طور پر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا قصد فرمایا۔ ایسے موقع پر پیغمبرؐ نے علیؐ کو مکہ میں رہ جانے کا حکم دیا اور فرمایا:

نَمَ عَلَىٰ فِرَاشِيٍّ وَأَتَشَحَّ بِبَرِدِيِّ الْخَضْرِيِّ الْأَخْضَرِ فَنَمَ فِيهِ

”اے علیؐ تم میرے بستر پر میری بیز چادر اوڑھ کر سو جاؤ“

بڑا ہی سخت مرحلہ اور بہت مشکل امتحان تھا وہ !! لیکن جس نے پیغمبرؐ سے وفاداری اور

جانبازی کا عہد و بیان کیا تھا، اسے کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ وہ سرفوشی اور فدا کاری کو ظاہر کرنے کے لئے نبیؐ کے بستر پر ان کی سبز چادر اوڑھ کر اٹمیناں سے سو گیا اور پیغمبرؐ نے بڑے اٹمیناں سے ہجرت کی۔ قسطلانی کا بیان ہے کہ ”فَكَانَ أَوَّلَ مَنْ شَرِيَ نَفْسَهُ“، ”عَلَى“ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے نفس کو بیچا اور اپنے کو معرض خطر میں ڈال دیا۔“ (مواہب الدینیہ، ج/۱، ص/۸۷)

امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ اس موقع پر علیؐ کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی: {وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ إِبْيَاعًا مَرْضَاةً اللَّهُ وَاللَّهُ رَأَى وَفِي الْعِبَادِ} (بقرہ/۲۰) (تاریخ خمیس، ج/۱، ص/۳۶۸)

اکثر مورخین نے وضاحت کی ہے کہ پیغمبرؐ نے ہجرت کے بعد علیؐ کو اس لئے مکہ میں چھوڑا کہ آپ ان امانتوں کو لوٹا دیں جو پیغمبرؐ کے پاس لوگ رکھ گئے تھے۔

(ملاحظہ فرمائیں: تاریخ ابوالفضل اعج/۱، ص/۱۲۶، کامل ابن اشیم، ج/۲، ص/۳۹) ہجرت سے متعلق واقعات کو مسلمانوں کے صف اول کی جن تاریخوں اور اہل سنت حضرات کی معتبر تحریروں نے محفوظ کیا ہے ان میں سیرۃ ابن اسحاق، تاریخ طبری، صحیح حاکم، مسند احمد ابن حنبل، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور خصائص نسائی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

علیؐ: پیغمبرؐ کے معنوی بھائی

مدینہ پہنچنے کے بعد پیغمبرؐ نے مہاجر و انصار کو آپس میں بھائی بنایا۔ یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ معنوی اور روحانی برادری انہیں دو افراد کے درمیان قائم ہوتی ہے جو خصوصیات اخلاق اور عادات و فضائل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہوں۔

چنانچہ پیغمبرؐ نے اس موقع پر حمزہ کو زید ابن حارثہ کا، عثمان کو عبد الرحمن ابن عوف کا، زید کو ابن مسعود کا، عبیدہ ابن حارثہ کو بلاں کا، معصب ابن عمری کو سعد ابن وقاص کا، ابو عبیدہ جراح کو سالم کا، مولیٰ ابی خذیله اور سعید ابن زید کو طلحہ کا بھائی اور علیؐ کو پیغمبرؐ نے اپنا بھائی بنایا۔ اس سلسلہ میں

مشہور سوراخ ابوال福德 اکھتا ہے:

أَخْيَرَ رَسُولِ اللَّهِ فَاتَّحَدَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَى ابْنِ أَبِي طَالِبٍ اخْحَاؤْ كَانَ عَلَى يَقُولُ عَلَى
مِنْبَرِ الْكُوفَةِ اِيَامَ خَلَاقِهِ اَنَا عَبْدُ اللَّهِ وَ اَخْوَرَ رَسُولَ اللَّهِ

آنحضرت نے اپنے اصحاب کے درمیان مواخات قرار دی اور علیؐ ابن ابی طالب کو اپنا بھائی بنایا علیؐ اپنی خلافت کے زمانہ میں منبر کوفہ پر فرماتے تھے کہ میں بندہ خدا اور رسولؐ کا بھائی ہوں۔ (تاریخ ابوال福德 اعج/۱، ص/۱۲۷)

ایک دوسرے موقع پر بھی پیغمبرؐ نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا مگر علیؐ کو اپنا بھائی بنانے کے لئے مخصوص فرمایا۔ ابن عبد البر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ ”اَخْيَرَ رَسُولِ اللَّهِ بَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ ثُمَّ اَخْيَرَ بَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْاَنْصَارِ وَ قَالَ فِي كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلَى اَنْتَ اَخْيَرَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“

”رسولؐ خدا نے ایک مرتبہ مہاجرین کے درمیان اور دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ اخت کا اعلان فرمایا اور ہر بار آپؐ نے علیؐ سے فرمایا کہ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔“ (استیعاب، ج/۲، ص/۳۷۳)

یہ واقعہ مندرجہ ذیل کتابوں میں بھی موجود ہے۔ صحیح ترمذی کتاب المناقب ص/۲۰، سنن احمد ابن حنبل ج/۳، ص/۱۵۳، ۱۹۰، ۲۰۲، ۲۷۱، سنن نسائی نکاح، ۸۲، طبرانی و ابن عساکر۔

۲۔ ہجری

جنگ بد رجوع ۲ نہ میں ہوئی تاریخ اسلام کی پہلی جنگ ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ اسلامیہ اور جنگی ساز و سامان بھی نہیں کے برابر تھے۔ میدان جنگ سے تھوڑے فاصلہ پر پیغمبرؐ کے لئے ایک ایسی جگہ بنائی گئی جہاں سے وہ مجاہد جنگ کے حالات کا جائزہ لیں اور فوج کی حرکات و سکنات کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس جگہ کو ”عریش“ کہتے ہیں۔

اس جنگ میں معدودے چند افراد ہی نے بہترین نبرد آزمائی کا ثبوت دیا۔ ان میں سے پیغمبرؐ کے اعزاء جیسے حضرت حمزہ ابن عبد المطلب، عبیدہ ابن حارث اور علیؑ سب سے نمایاں تھے۔ عبیدہ اس جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور علیؑ نے بہت سے سرب راؤں وہ کفار کو تباخ کیا۔ (تاریخ ابو الفداء، ج ۱، ص ۱۲۹)

اسی سال پیغمبرؐ نے علیؑ کو اپنی دامادی کا شرف بخشنا اور اپنی چیختی بیٹی فاطمہ زہراؓ کو علیؑ کے حوالہ عقد میں دیا جب علیؑ نے خواستگاری کی تو پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا "قد امر نی ربی بذالک "خدا نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔" عقد کے بعد حضرت نے جناب سیدہؓ سے فرمایا "امانٰت ضیفیٰ یا فاطمۃ اَنَّ اللَّهَ اخْتَارَ مِنْ أَهْلِ الْأَزْضِرِ رَجُلَيْنِ جَعَلَ أَحَدَهُمَا أَبَاكَ وَالْأَخْرَ يَغْلِكَ" "اے فاطمہ گیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ خدا نے دنیا کے تمام لوگوں میں سے دو افراد کو منتخب کیا ان میں سے ایک کو تمہارا باپ اور دوسرے کو تمہارا شوہر قرار دیا۔" (ریاض النصرہ، ج ۲، ص ۱۸۲) اس سے پتہ چلتا ہے یہ شادی فقط پیغمبرؐ سے علیؑ کی قرابت کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ اس رشتہ کا سبب خدا کا صریحی حکم اور علیؑ کی ذاتی فضیلت ہے۔

۳۔ ہجری کی جملکیاں

۳۔ ہ میں جنگ احمد واقع ہوئی۔ یہ جنگ ایسی شدید، فیصلہ کرن، اور تقدیر ساز تھی کہ مشیت الہی نے اسے مسلمانوں کا معیار عزم و ثبات قرار دینا چاہا۔ آغاز جنگ میں حالات امید افرا تھے۔ اس لئے کہ علیؑ نے فوج مخالف کے علمدار طلحہ بن عثمان کو قتل کر دیا تھا شمن جنگ کی ابتدائی کامیابی کو اپنے ہاتھوں سے کھو چکے تھے اور ہار مان کر فرار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن کفار جب بھاگنے لگے تو کچھ مسلمان مال غنیمت کی لائچ میں پڑ گئے۔ خالد ابن ولید جس نے اس وقت تک اسلام نہیں قبول کیا تھا، پچھے سے حملہ کر کے مسلمانوں کو غافل کر دیا۔ ناظرین اس کے نتیجہ کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبانی سماعت فرمائیں۔ مدارج النبیۃ میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمان شکست سے دو چار ہوئے اور انہوں نے پیغمبرؐ کو تھا چھوڑ دیا۔ حضرت غضیناً ک ہوئے پسینہ کے قطرے آپ کی مقدس پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔ ایسے عالم میں آپ نے دیکھا کہ علیؑ آپ کے پہلو میں کھڑے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں سے کیوں نہ جاملے یعنی تم نے کیوں فرانہیں کیا۔ علیؑ نے فرمایا: "اَكْفَرْ بَعْدَ الْإِيمَانِ اَنَّ لِي بَكَ اُشْوَةً" (کیا میں ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاؤں۔ میں تو آپ کی اقتدا کر رہا ہوں۔) مجھے یاروں سے کیا سروکار اتنے میں کچھ کفار آنحضرتؐ کی طرف متوجہ ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ مجھے ان سے بچاؤ اور حق خدمت ادا کرو یہ وقت نصرت ہے۔ علیؑ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسی جنگ کی کہ بہت سے افراد کو واصل جہنم کیا بقیہ افراد انتہا ہو گئی بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز علیؑ کے جسم مبارک پر رسولہ زخم لگے تھے۔

۴۔ ہجری کے واقعات پر ایک نظر

۴۔ ہ میں جنگ خندق ہوئی۔ میدان جنگ میں عمر و ابن عبد و جیسا پہلوان موجود تھا اور رجز خونی کر رہا تھا۔ کس میں ہمت تھی جو اپنے کوموت کے منہ میں جھونک دے۔ تاریخ مندرجہ ذیل الفاظ میں اس موقع کی منظر کشی کرتی ہے:

" طلب المبارزة و الأصحاب ساکثون كأنما على رؤسهم الطين لأنهم كان يعلمون شجاعته " وہ اپنا مقابل طلب کر رہا تھا اور سارے افراد ساکت تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے سروں پر طائر بیٹھا ہو۔ اگر وہ اپنا منہ بھی کھولیں تو پرندے اڑ جائیں اس لئے کہ وہ دشمن کی بہادری سے واقف تھے۔ (تاریخ خمیس، ج ۱، ص ۵۲)

امیر المؤمنینؑ نے مسلمانوں کی آبرو بچا لی۔ آپ اس کی پہلی ہی آواز پر مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ پیغمبرؐ نے پہلے تو اجازت نہیں دی لیکن جب یہ دیکھا کہ جمع پر مستقل سکوت چھایا ہوا ہے اور عمر و بن عبد و دکی ڈینگیں بڑھتی جا رہی ہے، تب انہوں نے علیؑ کو اجازت دی اور بالآخر علیؑ ہی

کی تلوار تھی جس نے جنگ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کیا۔ (تاریخ خمیس، ج/۱، ص/۷۴)

صلح حدیبیہ

۸۰ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ پیغمبر مطہر اُجھ کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین نے حج نہیں کرنے دیا تو پیغمبرؐ خاص شرطوں کے ساتھ صلح کرنے اور پلٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس صلح کی شرطوں کو لکھنے والے علیؐ تھے۔

سے بھری کے واقعات

۸۰ھ میں جنگ خیر واقع ہوئی۔ اتفاقاً امیر المؤمنین علیؐ ابن ابی طالبؑ آشوب چشم میں بتلا تھے۔ اسی وجہ سے آپ مدینہ میں تشریف فرماتھی قلعوں میں سب سے مضبوط اور مستحکم قلعہ جو دشمن کی پناہ گاہ بھی تھا، وہ قلعہ خیر تھا۔

خیر میں مسلسل تین دن تک مسلمانوں کی شکست کے بعد چوتھے دن پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا:

”أَمَا وَاللَّهُ لَا يَعْطِي إِلَيْهِ الْرَّايْةَ غَدَارَ جَلَالًا كَزَارًا غَيْرَ فَرَارٍ يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَفْتَحُ اللَّهُ عَلَى يَدِهِ“ (خدا کی قسم کل ہم اس کو علم دیں گے جو مرد (شجاع) ہے، کرار، فرار کرنے والا نہیں ہے، خدا اور اس کے پیغمبرؐ کو دوست رکھتا ہے، خدا اور پیغمبرؐ بھی اس کو دوست رکھتے ہیں۔ خدا اس کے ہاتھوں پر کامیابی عطا کرے گا۔) (خصائص نبی، ص/۱۱، تاریخ خمیس، ج/۲، ص/۵۲، استیعاب، ج/۲، ص/۳۷، الریاض النضرۃ، ج/۳، ص/۱۸)

بعض روایتوں میں ”کرا غیر فرار“ نہیں ہے جیسے صحیح بخاری، ج/۳، ص/۲۳، طبقات ابن سعد، ص/۸۰، لیکن دوسرے مستند مأخذوں جیسے، ابن اسحاق، نسائی، احمد ابن جنبل (مندرجہ طبری) (تاریخ) طبری، نیہقی اور صرف اول کے تمام علماء و محدثین و مورخین نے اس جملہ کو لکھا ہے۔ دوسرے دن پیغمبرؐ نے علم کو جھکا دیا اور فرمایا: ”اس علم کو کون لے گا؟“ اس کے بعد آپ

نے فرمایا: ”علیؐ تم لو“ علیؐ نے علم کو سنبھالا اور قلعہ کو فتح کر کے کامیاب و کامران پلٹے۔

سے بھری کے واقعات پر ایک نظر

۸۰ھ میں مکہ فتح ہوا۔ تمام مسلمان خوشی کا جشن منانے میں مشغول تھے لیکن صدر اسلام کے معاشرے کے دو ممتاز شخصیتیں یعنی پیغمبرؐ علیؐ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔ دونوں ہی خانہ خدا کو بتوں سے پاک کرنے میں مشغول تھے۔ پیغمبرؐ نے سب سے بڑے بٹ کو توڑنے کے لئے علیؐ کو اپنے کاندھے پر سوار کیا علیؐ نے اس بٹ کو توڑ کر گرا یا۔

مشہور مورخ اہل سنت دیار بکری تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت پیغمبرؐ نے علیؐ سے کہا: ”طوبی لک تَعْمَلُ الْحَقَّ وَ طُوبی لِي أَحْمَلُ الْحَقَّ“ (علیؐ تم کو مبارک ہو تم حق کے لئے یہ کام انجام دے رہے ہو اور مجھے بھی مبارک ہو کہ میں نے حق کا بوجہ اٹھایا یعنی حق کے لئے تم کو اپنے کاندھے پر سوار کیا ہے۔) (تاریخ خمیس، ج/۲، ص/۹۵)

ممکن ہے کوئی خیال کرے کہ یہ بہت ہی چھوٹے مسائل ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے مگر حقیقتاً انہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے تاریخ نبی ہے اور ایک محقق کے لئے بظاہر یہی چھوٹے چھوٹے واقعات حقیقت تک پہنچانے میں شیع راہ بن جاتے ہیں۔ انہیں کے سہارے وہ علمی جستجو اور صحیح تبیہ نکالنے میں مدد حاصل کرتا ہے۔

۸۰ھ کے آخر میں جنگ حنین واقع ہوئی۔ یہ آخری جنگ تھی جس میں پیغمبرؐ نے شرکت کی۔ پیغمبرؐ زندگی میں اس جنگ کے بعد فقط جنگ تباک تھی جس میں آپ بغیر شرکت کے واپس پلٹ آئے تھے۔

جنگ حنین میں پیش آنے والے اتفاقات بہت ہی حیرت انگیز اور افسوس ناک ہیں۔ قرآن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں جنگ کی مظکوشتی کی ہے:

{وَيَوْمَ حَنَّينٍ إِذْ أَعْجَبَنَكُمْ كَثُرَتُكُمْ فَلَمْ يَعْنِكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ

الأَرْضِ بِمَا رَأَى حَبْثَ ثُمَّ وَلَيْسَ مُدْبِرِينَ { (توبہ/۲۵)

”جنگ حنین کے دن کو یاد کرو جس دن تم کو تمہاری کثرت نے مغروکر دیا تھا لیکن اس سے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم جنگ سے فرار کر گئے۔“

حادیث یہ پیش آیا کہ مخالف لشکر نے جو کمین گاہ میں چھپا ہوا تھا اپنے حملہ کر دیا اور مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے۔ آٹھ آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی میدان میں باقی نہیں بچا۔ محدث ابن ابی شیبہ کہتے ہیں: ”پیغمبرؐ کے ساتھ صرف چار اشخاص رہ گئے تھے تین افراد تھیں ہاشم کے یعنی علی، عباس جو پیغمبرؐ کے ساتھ تھے اور ابوسفیان جو گھوڑے کی لجام پکڑے ہوئے تھے اور این مسعود پہلو میں۔ دشمنوں میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو پیغمبرؐ کی طرف بڑھا ہوا قتل نہ کیا گیا ہو۔“ (طبری، ج/۲، ص/۱۲۹)

”استیعاب“ میں عباس کے حالات کے بیان میں لکھا ہے: ”جنگ حنین میں سب فرار کر گئے سوائے عباس و عمر و علی و ابوسفیان کے۔“ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ پیغمبرؐ کے خاندان کے صرف سات افراد رہ گئے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ”یہ سات افراد علی، عباس، فضل بن عباس، ابوسفیان، جعفر ابن ابوسفیان، رہبیعہ ابن حراثہ اور اسماء بن زید تھے۔ ان کے علاوہ آٹھویں امین ابن عبید تھے۔ اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد پیغمبرؐ نے شہر طائف کا محاصرہ کیا کیونکہ مشرکین نے جنگی چھاؤنی طائف میں منتقل کر دی تھی اور وہاں محاذا بنالیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک دن پیغمبرؐ نے علیؑ کو طلب فرمایا اور کچھ دیر تک خصوصی گفتگو کرتے رہے۔ اس واقعہ نے لوگوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہنا شروع کیں۔ بعض افراد نے کہا ”پیغمبرؐ ان کے ابن عم سے بڑی دیر تک رازدارانہ گفتگو (نجوی) ہوتی رہی۔“ جب پیغمبرؐ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ”میں نے علیؑ سے نجوی نہیں کیا بلکہ خدا نے ان سے نجوی کیا ہے“ یہ روایت صحیح ترمذی میں درج ہے اور امام ترمذی اس روایت کو علم درایت کی رو سے ”حسن“ اور ”صحیح“ سمجھتے ہیں۔

۹۔ ہجری کے واقعات

۹۔ ہجری میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ پیغمبرؐ کے انتقال کا ویک سال باقی تھا اور یہ غزوہ پیغمبرؐ کی زندگی کا آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ تھا، تیز اور گرم ہوا پھول پیوں کو جھلسائے دے رہی تھی۔ پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب، شمع توحید کے پروانوں کو حکم دیا کہ جنگ پر چلنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ لیکن علیؑ سے فرمایا: ”آپ مدینہ میں میری جگہ موجود ہیں۔“ علیؑ نے غمگین اچھے میں بڑی بے چینی سے فرمایا۔ ”خلفتی فی الصَّبَیْانِ وَ النَّسَائِ“ (آپ مجھے پھول اور عورتوں کے درمیان چھوڑے جا رہے ہیں؟)

پیغمبرؐ نے فرمایا۔ ”اما تَرْضَى أَن تَكُونَ مَنْ يَمْنَأَةً هَارِزَوْنَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا يَرِيَ بَعْدِي“ ”کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ میری نسبت سے تمہاری منزلت وہی ہے جو موسیٰ کی ہارون سے تھی، فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا؟“

۱۰۔ ہجری پر ایک نظر

۱۰۔ ہجری میں پیغمبرؐ نے علیؑ کو یمن کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ فرمایا۔ پیغمبرؐ نے پرچم خود تیار کیا اور علیؑ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ رکھا جس کا ایک سراسینہ پر اور دوسرا سراسقت پر لٹک رہا تھا۔

علیؑ تبلیغ کے لئے روانہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمان کے تمام قبائل اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے۔ علیؑ کا تبلیغ انجام دینے کے بعد مدینہ واپس لوٹ آئے۔

غدیر

اس سال کے آخر میں پیغمبرؐ نے وہ حج ادا کیا جو جمۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پیغمبرؐ کی زندگی کا آخری حج تھا۔ اس کے بعد آپؐ کی حیات کے چند ماہ اور باقی رہ گئے۔ جب پیغمبرؐ نے حج پر جانے کا ارادہ فرمایا تو علیؑ اس وقت زکوٰۃ خمس وصول کرنے کے لئے یمن گئے ہوئے

تھے لیکن وہاں سے جلد ہی لوٹ آئے اور پیغمبرؐ سے ملحق ہو گئے۔ حج تمام ہوا۔ پیغمبرؐ جب مکہ سے مدینہ کی جانب لوٹنے لگے تو اچانک آپ نے غدیر خم میں قافلہ کوٹھر انے کا حکم دیا۔ غدیر میں ایک جم غیر مسیحی اکٹھا ہو گیا۔ یہ اعلان ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ لوگوں کے لئے تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ ہزاروں افراد پیغمبرؐ تقریر کو سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ پیغمبرؐ نے پر تشریف لے گئے اور آپ نے ایک لمبا خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے آپ نے مسلمانوں کو اس بات کی خبر دی کہ ”میں بہت جلد اس دنیا سے رحلت کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے انجام دئے گئے کاموں کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ پھر مسلمانوں سے اسلام پر ثابت قدم رہنے کا عہد و پیمانہ لیا آپ نے فرمایا: اے لوگو! خدا مجھے جلد ہی اپنی بارگاہ میں بلاںے والا ہے اور میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں بھی ذمہ دار ہوں اور تم بھی ذمہ دار ہو۔ لہذا ہمیں دیکھنا ہے کہ ایسے موقع پر تم کیا کرو گے؟“

اس کے بعد آپ نے فرمایا: ”کیا تم اس بات کا اقرار نہیں کرو گے کہ اس معبدوں کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ جنت، جہنم، موت کے بعد زندہ کیا جانا حق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیامت آئے گی اور خدا مردوں کو زندہ کرے گا؟“ حاضرین نے جواب دیا: ”بے شک! ہم کو ان تمام بالتوں کا اقرار ہے۔“ پیغمبرؐ نے فرمایا: ”اے خدا تو گواہ رہنا۔“

پھر آپ نے فرمایا: ”اے لوگو! اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان کے اوپر خود ان کے نفس سے زیادہ حق رکھتا ہوں لہذا جس کا میں مولا ہوں، اس کے یہ علیؐ مولا ہیں (اور علیؐ کی طرف اشارہ فرمایا) پانے والے! تو اس کو دوست رکھنا جو علیؐ کو دوست رکھنے کے لئے اور اس کو دشمن رکھنا جو علیؐ سے دشمنی کرے۔“

اس کے بعد حضرت نے فرمایا: ”اے لوگو! میں تم سے پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا جب تم حوض کوثر پر میرے پاس پہنچو گے تو میں تم سے سوال کروں گا کہ میرے بعد تم نے ”تقلین“

کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“ تقلین میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جو ایسا وسیلہ ہے جس کا ایک سرا خدا سے ملا ہوا ہے اور دوسرا سر اتمہارے ہاتھ میں ہے، اسے مضبوطی سے کپڑے رہو، گمراہ نہ ہونا، حق کو باطل سے نہ بدلنا۔ تقلین کی دوسری فرد میری عترت اور اہل بیت ہیں۔ خدا نے مجھ کو خبر دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔

علامہ ابن حجر عسکری نے ”صواعق محقرة“ (ص/۲۵-۲۶، مطبوعہ مصر) میں اس روایت کو درج فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے تین بار اصحاب سے پوچھا: ”الست اوّلیْ بِكُمْ مِنْ نَفْسِكُمْ“ (کیا میں تم پر تمہارے نفسوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟)، لوگوں نے جواب دیا: ”بے شک! بے شک!!“ اس کے بعد پیغمبرؐ نے علیؐ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور فرمایا: ”مَنْ كَنْتَ مَوْلَاهُ فَهُدَا عَلَىٰ مَوْلَاهُ اللَّهُمَّ وَإِلَيْ مَنْ وَالَّهُ وَعَادِ مَنْ عَادَهُ وَأَنْصَرْ مَنْ نَصَرَهُ وَأَخْذَلْ مَنْ خَذَلَهُ۔“

”جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؐ بھی مولا ہیں، خدا یا! تو اس کو دوست رکھ جو علیؐ کو دوست رکھ کر اور اس کو دشمن رکھ جو علیؐ سے دشمنی کرے، جو علیؐ کی مدد کرے تو اس کی مدد فرماجو علیؐ کو چھوڑ دے اس کو ذلیل کر، علیؐ جس طرف مزیں حق کو ادھر موزد ہے۔“

ابن حجر اس روایت کی تحقیق کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی، نسائی، احمد ابن حنبل اور محدثین کی ایک کثیر جماعت نے اسے درج کیا ہے۔ اس کے طریق اسناد بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ سولہ صحابیوں نے اس روایت کو نقش کیا ہے اور احمد ابن حنبل ایک جگہ کہتے ہیں کہ تیس اصحاب نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو اپنے کانوں سے سنائے اس کے اکثر اسناد صحیح اور حسن ہیں۔ (صواعق محقرة، ص/۲۵، مطبوعہ مصر)

”استیعاب“ (ابن عبد البر)، ”اسد الغابۃ“ (ابن اثیر جزیری) اور مختلف کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔

امام الحدیثین حافظ ابن عقدہ نے ”موالات“ میں سو صحابیوں سے، امام جزری شافعی نے

تمیں اصحاب سے، امام احمد ابن حنبل نے بھی تیس اصحاب سے اور طبری نے ۵۷ اصحاب سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

محمد بن اسماعیل صنائی نے ”روضہ ندبہ“ میں، سیوطی نے ”جمع الجواہر“ میں، ذہبی نے ”تذکرۃ الحفاظ“ میں اور جزری نے ”سنی المطالب“ میں اس حدیث کو متواتر صحیح سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ ابن اسحاق، ابن سعد، مسلم، دارمی، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو ضبط تحریر کیا ہے۔ اس لئے کوئی بھی اس حدیث کی اصالت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس واقعہ کے موقع میں تمام فرقے اور نماہب ایک نظر ہیں۔ اس طرح علیؑ کی زندگی کا پہلا دور جو علیؑ میں پیغمبرؐ کی رحلت کے ساتھ تمام ہو گیا وہ سراسر اسلام کی راہ میں جہاد، ایثار اور نصرت کا دور ہے۔ شیعہ سنی تمام اہم تاریخ و حدیث کی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ حضرت علیؑ پیغمبرؐ کے سب سے قریبی اور نمایاں صحابی اور ہر جنگ کے سورا تھے۔ آپ نے اسلام میں سب پر سبقت کی۔ دعوت ذوالعشیرہ میں حمایت رسولؐ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہجرت کے موقع پر آپ نے جان کو تھیلی پر رکھا۔ ہجرت کے بعد پیغمبرؐ نے آپ کو اپنے روحانی بھائی ہونے کا اعلان فرمایا۔ جنگ بدرواحد و خیر و خندق میں مسلمانوں کی آبرو بچائی اور دین کا دفاع کیا اور آخر میں غدر خرم میں پیغمبرؐ نے آپ کو اپنے جانشین اور وصی کے طور پر پہنچوایا۔

اس تینیس (۲۳) برس کی مدت میں علیؑ ایسی شخصیت ہیں جو تمام واقعات میں موجود اور تمام معروکوں میں درخشان رہی۔ اس دور میں علیؑ کی نمایاں خصوصیتیں فدا کاری، ایثار و شجاعت، صداقت اور پیغمبرؐ پر ایمان ہے یعنی علیؑ دین اسلام کی پاسیداری کے لئے مسلسل ۲۳ سال تک ایثار، فدا کاری اور جہاد کا مظاہرہ کرتے رہے۔

دور دوم: پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ کی زندگی

جناب امیر المؤمنینؑ کی زندگی کا دوسرا دور رحلت پیغمبرؐ سے قبول خلافت یعنی الهہ سے

۲۵ تک ہے، یہ ان کی خاموشی کا دور ہے۔ یہ وہ ۲۵ سال کا طویل وقفہ ہے جب حضرت علیؑ مسلمانوں کے اتحاد اور اسلام کے وجود کی حفاظت کے لئے مہربن اور سیاست سے کنارہ کش رہے۔

اس میں شک نہیں کہ امیر المؤمنینؑ اپنی لیاقت اور پیغمبرؐ کے ارشاد گرامی کی بنا پر خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے اور پیغمبرؐ کے بعد جن سیاسی اصولوں کو اپنایا گیا تھا ان میں سے اکثر کے شدید مخالف تھے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ تھا اسلامی مساوات اور عدالت سے اخraf اور مقدار پر معیار کو قربان کر دینا۔ علیؑ کی نگاہوں میں اسلامی دنیا کی جغرافیائی اور سیاسی حدود کی توسعہ ثانوی حیثیت رکھتی تھی، اور جو زیادہ اہم تھا وہ عقیدتی گہرائیوں کی توسعہ اور دین کا تحفظ تھا۔

اس کے باوجود کہ امیر المؤمنینؑ نے مسلمانوں کی رہبری اور خلافت کو اپنا حق اور دوسروں کو اس اہلیت سے محروم سمجھا ہے۔ سیاسی رہبری کے ذریعہ حکومت اسلامی کا قیام اور اسلام کا استحکام علیؑ کا حق تھا، پھر بھی انہوں نے اپنی عمر کے ۲۵ سال مسلمانوں کے اتحاد کے لئے قربان کر دیئے۔ (بقول خود) ”آنکھ میں کامنا اور گلے میں بڑی“ ہونے کے باوجود خاموش رہے۔

رحلت پیغمبرؐ سے خلافت علیؑ تک کا ۲۵ سالہ دور خاموشی کا دور ہے، مگر یہ خاموشی اور سکوت ان معنوں میں ہے کہ انہوں نے اپنی وہ مشیر جو ہر مرکز میں بھلی کی طرح کوندا کرتی تھی اور جو اسلام کی فتح کا باعث ہوتی تھی اسے پھر بے نیام نہیں کیا اور کوئی مسلح جنگ نہیں کی۔ اس کے معنی نہیں کہ انہوں نے اعتراض نہیں کیا بلکہ سیاسی مصالح کی مخالفت نہیں کی یا سیاسی اور اجتماعی زندگی سے مطلقاً کنارہ کش ہو گئے۔ وہ رہنمائی کے فرائض کو برابر انجام دیتے رہے اور جب بھی انہوں نے دیکھا کہ آبروئے اسلام خطرے میں ہے تو سیاسی مشوروں سے بھی دربغ نہیں کیا۔

حضرت علیؑ خاموش کیوں رہے؟ اپنے حق کے لئے جنگ کیوں نہ کی؟ حقیقتاً امیر المؤمنینؑ جنگ وجدال اور فلکست و مرگ سے ڈرنے والے نہ تھے، اگر جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو کیا ہوتا؟ زیادہ یہ ہوتا کہ شہید ہو جاتے۔ علیؑ تو وہ ہیں جن کا اپنا قول تھا: وَاللَّهُ لَا يُنْبَأُ

طَالِبٌ آتَىهُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطَّفْلِ بِشَدَّدِ أَمْهَهُ، يَعْنِي "خدا کی قسم پر ابوطالب موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا ایک بچہ اپنی ماں کے سینے سے۔"

امیر المؤمنین کے سکوت کا سبب؟

امیر المؤمنین کی خاموشی کا یہ اقدام نہایت ہی جچا تلا اور منطقی تھا، مندرجہ ذیل اسباب پر غور کرنے کے بعد ہم صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

اسلام کا پودا نورس تھا اور ابھی تک با دسموم سے محفوظ نہیں تھا، ابھی اسلام زمانہ طفلی میں تھا اور اس کو سخت توجہ، نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی، اور علی سے بڑھ کر اسلام کا دروس کے دل میں ہو سکتا تھا؟ حضرت علیؑ اس ماں کی طرح تھے جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا تھا مگر وہ خاموش رہنے اور کوئی اقدام نہ کرنے پر مجبور ہے۔ اگر تلوار نکالتے ہیں تو ممکن ہے بچہ زخمی ہو جائے یا مرجائے۔ اگر ان ابتدائی مراحل میں ہی اسلامی معاشرہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو جاتا تو وجود اسلام کے خطرے میں پڑ جانے کا قوی امکان تھا اور جاہلیت کی طاقتیں جو ابھی بھی مضبوط تھیں انقلاب کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتی تھیں۔ رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد ارتداد کا مسئلہ جو "ردة" کہلاتی ہے، گوشہ و کنار میں شروع ہو چکا تھا۔ اگر اسلام میں خانہ جنگی شروع ہوتی تو اسلام ختم ہو جاتا ہے۔

اس زمانے کی نزاکت کے پیش نظر امیر المؤمنین کے لئے اتحاد اسلامی اور مسلمانوں کی بیجہتی و سری تمام باتوں سے زیادہ اہم تھی۔ ایران و روم کی بڑی طاقتیں، حجاز میں ظاہر ہونے والی نئی طاقت سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں۔ ابوسفیان جیسے قریشی منافق اور عبد اللہ بن ابی جیسے مدینے کے منافق، کسی بہانے کی تلاش میں تھے تاکہ امت اسلامی کے اتحاد کو ختم کر دیں۔ ان حالات میں حضرت علیؑ نے وجود اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لئے، سب سے بڑی ایثار و فربانی کا مظاہرہ فرمایا۔

نجح البلاغہ میں امیر المؤمنین خود فرماتے ہیں: "وَإِنَّمَا النَّذَلُ لَا مَحَافَةَ الْفُرْقَةِ بَيْنَ

الْمُسْلِمِينَ وَأَن يَعُودُ الْكُفَّارُ وَيَبُوْرُ الَّذِينَ لَكُنَّا عَلَىٰ غَيْرِ مَا كُنَّا لَهُمْ عَلَيْهِ" (خدا کی قسم مسلمانوں کے درمیان تفرقہ، کفر کے واپس آنے اور دین کے مٹ جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو میرا طرز عمل قطعی مختلف ہوتا) ابن الحدید نے خطبہ ۱۱۹ کی شرح میں بلکہ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولا نے فرمایا: "رسول خدا کے بعد قریش نے میرا حق غصب کر لیا لیکن میں نے صبر کیا"۔ "فَرَأَيْتَ أَنَّ الصَّابِرَ عَلَىٰ ذَلِكَ أَفْضَلُ مِنْ تَفْرِيَقِ الْكَلْمَةِ الْمُسْلِمِينَ وَسَفْكِ دَمَائِهِمْ وَالنَّاسُ حَدِّيْنُوْا عَهْدِ الْإِسْلَامِ وَالَّذِينَ تَمَّ حَضْرَ مَحْضَ الْوَطَبِ يُفْسِدُهُ أَدْنَى وَهُنْ وَيَعْكِسُهُ أَقْلَى خَلْقِ" (میں نے دیکھا کہ حق کے ضائع ہونے پر صبر کرنا، مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے اور ان کا خون بہانے سے بہتر ہے، کیونکہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اور دین تازہ برآمد کئے ہوئے مشکل کی مانند ہے، ذرا سی غلطی و کوتاہی اسے تباہ کرنے کے لئے کافی ہو گی اور ادنیٰ ترین شخص اس کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔)^(۱)

صرف ان دو اسباب یعنی اسلام کا تحفظ، اور امت اسلامی کی بیجہتی، کا مشاہدہ ہمیں یہ سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ وقت کے اس نازک دور میں امیر المؤمنین کے سکوت کا سبب کیا تھا اور آپ نے وحدت اسلامی کی حفاظت کے لئے کیا کیا ایثار اور قربانیاں پیش کیں، خود مولا فرماتے ہیں: "وَأَغْضَيْتَ عَلَى الْقَدْرِ وَشَرِبْتَ عَلَى الشَّجْرِ وَصَبَرْتَ عَلَى أَخْذِ الْكَظْمِ وَعَلَى أَمْرِ مِنْ الْعَلْقَمِ" (میری آنکھ میں کاشتا ہائیکن میں نے اپنی آنکھ کو بند کیا۔ میرے حلق میں ہڈی پھنس گئی تھی اور مجھے اسے حلق سے اترانا پڑا، میرا لگا گھٹا جارہا تھا اور حنظل سے کڑا اور میرے حلق میں پڑا تھا پھر بھی میں نے صبر کیا۔)

علیؑ کے مخالفین بظاہر کا میاب کیوں؟

علیؑ کی عظمت، فضیلت اور ایکاظن اطہر من اشتمس تھی اور تمام لوگ ان کے مرتبے اور ان کی

(۱) ملاحظہ ہو: سیری در نجح البلاغہ، استاد شہید مطہری، ص ۱۸۱-۱۸۲

فضیلت سے اچھی طرح واقف تھے پھر بھی کیوں سیاست، حقیقت پر غالب آگئی اور اسلامی معاشرے کی سیاسی رہبری سے وہ کیوں محروم رہے؟ اس کی ایک وجہ تھی کہ علیٰ سیاست بازی سے اجتناب کرتے تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ ابھی زمانہ طفلی میں تھا اور ایام جاہلیت کی قدر یہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ نیز شیخوخت، قبیلوں سے والیتگی اور جاہلانہ باتوں کا لحاظ باقی تھا۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ تیس برس تک حضرت علیٰ اسلام کی جماعت اور پیغمبرؐ کی نصرت میں قریش کے سربرا آورده افراد اور تمام قبائل سے نبرد آزمائے تھے۔ اس کی وجہ سے مشرکین مکہ میں کم ہی خاندان ایسے تھے جو شمشیر علیٰ کو فراموش کر سکے ہوں۔ قبائلی نظام میں جہاں انتقام معاشرے کے لئے جن کا مستحکم ترین سماجی اصول تھا ان کے لئے وہاں اس مسئلہ کا فراموش کر دینا بہت ہی مشکل تھا۔

ہمیں ایک اور نکتہ پر بھی نظر رکھنا چاہئے جس کی نشاندہی استاد مطہری نے اپنی معروف کتاب ”جاذبہ و دافعہ علیٰ علیہ السلام“ میں کی ہے۔ عظیم تاریخی شخصیتوں کے خصائص میں ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان میں جاذبہ اور دافعہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود رہی ہیں۔ بے خاصیت شخصیتوں میں نہ قوت جاذبہ ہوتی ہے نہ قوت دافعہ ان کے نہ جانی دشمن ہوتے ہیں، نہ جاں شمار دوست۔ مگر علیٰ میں جاذبہ و دافعہ دونوں ہی قوتیں غیر معمولی تھیں، جن کی خصوصیت ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ایک مقصد رکھتے ہیں ایک اصول رکھتے ہیں ایسے لوگوں میں قوت جاذبہ بھی ہوتی ہے اور قوت دافعہ بھی۔ شہید مطہریؒ لکھتے ہیں: ”شاید کسی بھی زمانے میں کوئی دوسرا علیٰ سے بڑھ کر قوی قوت جاذبہ اور قوت دافعہ کا مالک نہ ملے گا، دوست ایسے جوان کے نام پر جان دے دیں اور دشمن ایسے کہ ان کے نام سے اندر رخت بیچ و تاپ کھاتے رہتے ہیں۔ علیٰ نے اپنے دشمن پیدا کئے اور یہ ان کی عظمت و بزرگی کا ایک اور ثبوت ہے۔ ہر شہنشاہ اور مقصد رکھنے والا ہر شخص خصوصاً انقلابی انسان اپنے اصولوں کی ترویج کی راہ میں بہت سے بدترین قسم کے دشمن اور مخالف پیدا بھی کر لیتا ہے۔“^(۱)

علیٰ کا فیصلہ کن انداز اور اصولی و مسلکی (مشنی) بتاؤ اس بات سے مانع تھا کہ وہ ہر ایک سے سمجھوتا کریں۔

علیٰ کو نظر انداز کرنے کی چوتحی وجہ حسد و رقابت تھی۔ علیٰ کی شخصیت تیس برس تک پیغمبرؐ کی نظر میں سب سے قربی معتقد شخصیت تھی اور تمام حادث و آشوب میں انہوں نے نمایاں اور ممتاز کردار ادا کیا ہے۔ اس مسئلے نے اپنے کو ”بزرگان قوم“ سمجھنے والے بہت سے لوگوں میں احساس کمتری کے جذبے کو ابھارا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو علیٰ سے بغض و حسد میں بٹلا کر دیا تھا۔ ہر مرکز میں یہی بیس بائیس سال کا جوان تھا جس نے ہر جنگ کے نتیجے کو اسلام کے حق میں بدل دیا۔ ہر واقعہ میں پیغمبرؐ نے خاص کلیدی کردار (Key-role) کو ان کے حوالہ کیا۔ علیٰ ہیں جن کو پیغمبرؐ نے اپنا معنوی برادر بنایا۔ وہی ہیں جو دامادی اور حضرت فاطمہؓ سے شادی کے لئے منتخب ہوئے۔ اس طرح کے مسائل نے اسلامی معاشرہ کے بہت سے بارسون خ افراد کے دلوں میں گردہ ڈال دی۔ اسی وجہ سے جارج جردوک (George Jordoc) کہتا ہے کہ: ”علیٰ کی تمام تکالیف اور اذیتیں ان کی عظمتوں کا خیازہ تھیں۔“

تیسرا دور: دور خلافت

۵۳ھ کے اوآخر میں خلیفہ سوم کی وفات ہوئی اور عوام کے اصرار اور ان کے اجماع سے علیٰ ظاہری خلیفہ ہوئے۔ اسی تاریخ سے امیر المؤمنینؑ کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی مدت ان کی شہادت تک چار سال نوماہ اور چند روز ہے۔

تیسرا دور علیٰ کی خلافت کا زمانہ ہے۔ روح اسلام کو عمل میں ظاہر کرنے کا دور ہے۔ علیٰ چاہتے ہیں کہ نظام اسلام خصوصاً عدالت اور مساوات اسلامی کو راجح کریں۔ یہ دور وہ ہے جب علیٰ ایک عظیم سلطنت (سامراج) قلمرو کے مطلق سربراہ ہیں جس کی وسعت فلسطین، لبنان، عربستان، یمن، عراق، ایران، شام، مصر اور دیگر مقامات تک ہے لیکن اس کے باوجود جو کوئی روئی کھاتے ہیں

(۱) ملاحظہ ہو: کتاب جاذبہ و دافعہ علیٰ علیہ السلام، ص ۱۰۸

اور خاک پر بیٹھ کر فقیروں کے دستخوان میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام اور قیصر و کسری کے نظام میں موجود فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے نظام کی داعی بنل ڈالیں جس میں ظالم و مظلوم کا کوئی وجود نہ ہو، ہر شخص صرف خدا کا بندہ ہو، آزاد ہو اور عدالت اور خدا کے حضور میں سب ایک صفائی کھڑے ہوں۔

علیؑ اس آزمائشی دور میں اسلام کے سیاسی، عدالتی اور اقتصادی نظام کو اسی معیار پر لانا چاہ رہے تھے جس معیار پر پیغمبر اسلام نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، مگر چونکہ پیغمبر اسلام کے بعد سنگ بنیادی غلط رکھ دیا گیا تھا اس وجہ سے علیؑ کو بے شمار مشکلات اور بے اندازہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، مسلمان خوشحال زندگی کے عادی ہو چکے تھے، ان میں تفریق و استھصال کی عادت پڑ چکی تھی، ایام جامیت کی قدریں پلٹ آئی تھیں، جاہلانت تعصب سرا جھار رہا تھا، ان تمام مشکلات کے باوجود علیؑ مساوات و عدالتِ اسلامی کی ترویج کے لئے کوشش کرتے رہے۔ مملکتِ اسلامی کے سربراہ اور سیاسی رہبر منتخب ہونے کے بعد علیؑ نمبر پر تشریف لے گئے اور اعلان کیا: ”میں خلافت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے بعد جو شخص بھی امور (حکومت) کی باگ ڈورا پنے ہاتھ میں لیتا ہے اگر وہ عدالت کرتا ہے تو اس کی نجات ہوگی، ورنہ وہ قرعہ جنم میں گرے گا۔“ اس کے بعد اپنی حکومت کا اعلان اس طرح کیا: ”وہ جماعت یا گروہ جس کو دنیا نے اپنے اندر غرق کر لیا ہے جس نے املاک، نہریں، عمدہ گھوڑے اور نازک اندام کنیزوں کو اپنے لئے مہیا کر لیا ہے، کل میں یہ تمام چیزیں ان سے واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دوں گا اور انہیں اس میں سے صرف اتنا ہی دوں گا جتنے کے وہ حصدار ہیں۔ میں فوری طور پر اپنے واضح منصوبہ کا اعلان کرتا ہوں۔“^(۱)

پیغمبر اسلامؐ کے بعد معاشرے میں ایام جامیت کے بہت سے آثار دوبارہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ ”حقیقت“ کو ”مصلحت“ پر قربان کر دیا گیا تھا، جہالت کی قوت لوگوں پر حاوی

تھی، معاشرے میں نا انصافیوں، ظلم اور تفریق کا بھی زور بڑھنے لگا تھا۔ جو لوگ خود کو پیغمبر اسلام کے مقرب اور ”مجاہد اول“ شمار کرتے تھے اپنے لئے خصوصی امتیازات و تعیش کے قائل تھے، وہ جدید حاکم طبقہ کی صورت میں بر سر اقتدار آگئے تھے اور قبائلی تفریق اور نسلی نظام کو انہوں نے دوبارہ رانج کر دیا تھا۔ عنان خلافت سنبھالنے کے بعد علیؑ نے معاشرے سے اس غلط روشن کو مٹانے اور اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کی کوشش کی۔ جن لوگوں کا مفاد خطرے میں پڑ گیا تھا، وہ مختلف بہانوں سے علیؑ کے مقابلہ میں آئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ کے پورے عہد خلافت کے پانچ سال جنگ و کشاکش کی نذر ہو گئے۔ انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا گیا۔ مگر امیر المؤمنین نے ہر مشکل کو ہر پریشانی کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا مگر ”حقیقت“ کو بھی ”مصلحت“ پر قربان نہیں کیا یہاں تک کہ اسی راہ میں شہید ہو گئے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: قُتْلَ فِي مَحْرَابِهِ لِشَدَّةِ عَدْلِهِ۔ (وہ عدل و انصاف میں اپنی سختی کی وجہ سے محرب میں قتل کئے گئے)۔

علیؑ اور معاشرے کی تبدیلی:

علیؑ معاشرے کی تبدیلی میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر علیؑ پیغمبر اسلام کے بعد براؤ راست بلا فاصلہ خلافت سنبھالتے تو یقیناً پوری شدومد کے ساتھ حقیقی نظام اسلام کو رانج کر دیتے، لیکن ۲۵ سال کے وقفہ میں بالخصوص خلافت سوم اور مردان و معاویہ کے لوٹ ماروا لے دو را قتل اور معاشرہ جنگ، عدل، جہاد اور شہادت کی راہ سے ہٹ چکا تھا اور تن آسمانی، دولت کی جمع خوری اور تحصب کا شکار ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں لوگوں کا خصوصاً مذکورہ بالا طبقہ کا علیؑ کے حسب نشواء اسلامی قید و بند اور نظام عدل و مساوات کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ علیؑ سے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ احکام اسلام اور نظام عدالت کے معاملہ میں کوئی تسامی برتیں یا ”حقیقت“ کو ”مصلحت“ پر قربان کرتے ہوئے کسی سمجھوتے کے متعلق سوچیں۔ عام لوگ جو ”بزرگانِ قوم“ کے تابع اور جبل کا شکار تھے تن آسمانی کے عادی ہو چکے تھے وہ علیؑ کے اقدامات کے حق میں

نہ تھے اور ان کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ غرض کر علیٰ اکیلی شخصیت ہیں اور ایسے معاشرے میں پڑ گئے جہاں ان کی توقعات کو سمجھنے والا اور ان کے نفاذ کا تخلی کرنے والا کوئی نہیں ہے

علیٰ کون لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا؟

علیٰ کو عدالت و مساوات قائم کرنے اور احکام اسلام کے اجرائی کوشش میں تین گروہوں سے نبرداز ماہونا پڑا جن کے نام ان کی اصطلاح میں ”قسطین“، ”مارقین“ اور ”ناکشین“ تھے۔

(۱) قسطین

قطع اور قاسط سے مانوذ ہے۔

قاسط وہ ہے جو قحط کے خلاف، عدل کی ضد، تمگر، غاصب، خودسر ہیں جن پر روح نفاق اور جن پر سیاست حاوی ہے اور زیادہ سے زیادہ اقتدار کے طالب ہیں۔ چونکہ علیٰ کا مقصد ظلم و جور کے خلاف جنگ تھا اس لئے اس گروہ سے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ علیٰ اور ”قسطین“ کے درمیان جنگ کا نمونہ ”صفین“ ہے۔

(۲) ناکشین

ناکشین یعنی عہد شکن، انسان کو ادھر میں چھوڑ دینے والے اور اپنے مفاد کی خاطر اور خود غرضی میں دوسروں کی پیٹھ میں خبز گھونپنے والے، یہ سرمایہ پرست تھے۔ علیٰ کے نظام عدل و مساوات نے ان کے حرص طمع کے پندار کو مجرور کیا۔ ”جنگ جمل“ ناکشین سے نبرداز مائی کا نمونہ ہے۔

(۳) مارقین

مارقین وہ تھے جو بظاہر زہاد خشک زاہد، بیراگی لیکن باطن بے حد متعصب تھے۔ کج فہمی، تعصب، بے شوری، جہالت اور افراط کی بنابری یہ علیٰ سے ٹکرائے۔ خوارج ”نہروان“ اسی گروہ

کی مثال ہیں۔^(۱)

علیٰ کا مقصد معاشرے میں اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی نظام کو مکمل طور پر راجح کرنا اور جہاں اسلام کو ایام جاہلیت کے ان عناصر کے دوبارہ اقتدار سے بچانا تھا جنہوں نے بعد میں بنی امیہ کی صورت میں مسلمانوں کی سیاسی رہبری کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، مگر مذکورہ بالاتینوں گروہوں سے کشکش علیٰ کی مقصد برآری میں حارج رہی، مگر یہ علیٰ ہی کی ذات تھی جس نے اپنی خاموش تقریر اور انداز نشست و برخواست کے ذریعہ اسلام کی حقیقی روشن کو بچا کر بطور امامت تاریخ (آنندہ نسلوں) کے سپرد کر دیا۔

(۱) ملاحظہ ہو: قسطین، ناکشین، مارقین، ڈاکٹر شریعتی اور ”جاذبہ و دافعہ علیٰ علیہ السلام، استاد مطہری، ص ۱۱۱ و ۱۱۳۔

امام حسن علیہ السلام:

شایعی اسلام سے امامت والے اسلام کے مقابلہ کے مظہر

اللہ تعالیٰ نے انہمہ امامت کے لئے نمونہ بنایا ہے۔ اسی وجہ سے ہر امام کو مختلف سیاسی اور سماجی ماحول ملا تاکہ معاشرے میں موجود مختلف مسائل سے متعلق ان کا رد عمل سامنے آئے اور اس طرح مسلمانوں کے عملی راہنمابن سکیں۔ انہوں نے غالفوں سے مقابلے کے مختلف انداز اور طریقے اپنائے اور یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ زمانے کے حالات کے مطابق لا جگہ عمل اختیار کریں، مگر ان سب کا مقتنقہ مقصود دین کی حفاظت اور اسلام کی برتری ہو۔ اماموں کے مقابلے کی صورتیں اور ڈھنگ تو مختلف تھے مگر مقصود مشترک تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ کسی نے مسلح جنگ کے ذریعہ مقصود میں کامیابی حاصل کی، کسی نے صلح کے ذریعہ۔ ان تمام پیشواؤں میں امام حسنؑ کے حالات اور ان کی جنگ کا انداز ایک مخصوص خصوصیت کا حامل ہے۔

امام حسنؑ: سامراج کے مقابلہ میں امامت کے علمبردار

حضرت معاویہ اسلام کے سیاسی نظام کو امامت سے بدل کر ”ملوکیت“ (شایعی/سامراج) کی شکل میں لانے کے بانی اور نمونہ ہیں۔ جو مقابلہ امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان ہوا، وہ دراصل امامت اور سامراج کا مقابلہ تھا۔

امامت کا حصی مقصود اسلام کو رواج دینا تھا جبکہ اسی کے برعکس ”ملوکیت“ کا مقصود اسلام کے نام پر حصول اقتدار کی خاطر ہر حرب کا استعمال کرنا تھا، جبکہ ”امامت“ سختی کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پابندی تھی۔

ملوکیت صرف اسی حد تک اسلام کی نام لیواتھی اور اسے مانتی تھی جس حد تک اسلام کو مانتا اور اس کا نام لینا عوام کو فریب کے جال میں پھنسانے میں کارآمد ہو جبکہ امامت اسی حد تک اقتدار

کی خواستگار تھی جتنا تحفظ اسلام کے لئے مفید ہو، یہاں تک کہ امامت تحفظ اسلام کی خاطر اقتدار سے دست بردار ہونے تک کوتیار تھی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جو اقتدار اسلام کی خدمت کے کام نہ آئے اس اقتدار کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

”امامت“ کا محور حقیقت تھا اور اس کا معیار قرآن اور سنت تھا جبکہ ملوکیت بنام اسلام کا محور ذاتی مفاد اور اس کا معیار ایران و روم کا دربار (سامراج) تھا۔ چنانچہ ملوکیت ”مصلحت جوڑی اور حکومت“ حقیقت جو۔ اسی وجہ سے ”امامت“ میں اقتدار موروٹی نہیں ہوتا جب کہ ”ملوکیت“ میں حکومت موروٹی ہوتی ہے۔ ”امامت والے اسلام“ میں سیاسی مرکز مسجدیں ہوتی ہیں جبکہ ”ملوکیت والے اسلام“ میں عظیم الشان محل سیاسی مرکز ہوتے ہیں۔ ”امامت والے اسلام“ میں بیت المال کو خدا اور امامت کی امانت تصور کیا جاتا ہے اور حکومتی اسلام میں خلیفہ کا ذاتی مال سمجھا جاتا ہے۔ ”امامت والے اسلام“ میں تمام سماجی کام عوام کے مشورہ سے ہوتا ہے اور عوام کو اس کا حق ہوتا ہے کہ جائز کی موافقت اور ناجائز کی مخالفت کریں جبکہ اس کے برعکس ملوکیت میں عوام کی زبانوں پر قفل لگادے جاتے ہیں، جو بُن عدی جیسے لوگ شہید کر دئے جاتے ہیں، قتل و غارتگری، خوف و دہشت، ظلم و جر اور پابندی کا نظام رائج ہوتا ہے۔ ”امامت“ میں قاضی (نوج) احکام خداوندی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور ملوکیت میں خلیفہ کی ضرورت اور مرضی کے مطابق احکامات نافذ ہوتے ہیں۔

امام حسنؑ اور معاویہ کا مقابلہ اقتدار کے دو دعویداروں کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ ”امامت“ اور ”ملوکیت“ کا مقابلہ ہے، دو طرز فکر اور دو راہ عمل کا مقابلہ ہے۔ امام حسنؑ جن لوگوں کے مقابلے پر تھے، وہ حقیقتاً مسلمان نہیں تھے بلکہ اسلام کی نقاب میں اسلام دشمن عناصر تھے۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑ تھے۔ یہ وہ انقلاب مخالف عناصر تھے جن کو شرکین مکہ کے سردار ابوسفیان نے جنم دیا تھا، جن کے دل میں انقلاب اسلام کے خلاف کیئے کا جوالاً کھٹی پھوٹ رہا تھا۔ یہ لوگ اندر ہی اندر دھیرے دھیرے انقلاب (اسلام) کے خلاف کھجڑی پکارہے تھے۔ اس موقع پر جبکہ معیار (Quantity) کو مقدار (Quality) پر قربان کیا جا رہا تھا، امام حسنؑ ان انقلاب غالفوں سے نبرد

آزمات تھے جو "ملوکیت بنام اسلام" کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔

امام حسنؑ نے صلح کیوں کی؟

امام حسنؑ نے صلح کیوں کی؟ اور اقتدار کو ملوکیت کے علمدار اور جاہلی بغاوت کے سربراہوں کے حوالے کیوں کر دیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے لازم ہے کہ مندرجہ ذیل تین نکات پر نظر رکھیں:-

(۱) پہلی بات یہ کہ چونکہ سلطنت روم و شام و ایران کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں غلط سیاست 'مقدار' کی طرف انحراف اور 'معیار' کی طرف سے عدم توجیہ کی وجہ سے مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان کے خیالات اور طرز فکر میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ لہذا جب انہیں ملوکیت میں اپنی سابقہ تہذیب، اخلاق اور طرز فکر کی جھلکیاں نظر آئیں تو امام حسنؑ کی سربراہی کے مقابلے میں جاہلیت کے تدریجی انقلاب کے سربراہوں کے تابع (Follower) ہو گئے۔ انہیں اسی میں بہتری اور بھلائی نظر آئی۔

نئے مسلمانوں کے قلب و ضمیر اور گوپے میں صحیح روح اسلام کے سراہیت نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی سابقہ تہذیب، عادات اور طرز فکر سے مماٹت کی بنا پر سلطنت روم و ایران کے عادات، تہذیب اور طرز فکر سے باسانی مانوں ہو گئے اور اسی کو اپنالیا۔ اس طرح معاویہ کی حکومت کے استقرار اور موروٹی سلطنت کی بنیاد کے استحکام کے لئے زمین ہموار ہوتی گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ کا دارالسلطنت شام ہے جہاں کے عوام قیصر و کسری کے نظام کے عادی ہو چکے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی نظام، جیسا کہ حضرت علیؑ چاہتے تھے، راجح نہ ہو سکا۔ "معیار"، "مقدار" پر قربان ہو چکا تھا۔ حضرت علیؑ اس نظریہ کے حامی تھے کہ اسلامی سلطنت کی حدود اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ سے زیادہ ضروری مسلمانوں کی موجودہ تعداد میں عقاائد،

اخلاق اور کروار کو پائدار کیا جانا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد کے ابتدائی برسوں میں قوت ایمان کی بنا پر اسلام کی سیاسی سرحدوں میں بے مثال توسعہ ہوئی اور مختلف تہذیب، عقاائد اور ملت کے افراد حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، مگر ان کے اس دینی اور فکری انقلاب کی طرف مناسب توجیہیں وی گئی جس کی حضرت علیؑ سخت تاکید فرماتے تھے۔ دوسروں سے امیر المؤمنینؑ کے نظریاتی اختلافات کے اسباب میں یہ بات بھی شامل تھی۔ ہم اسے "معیار" کو "مقدار" پر قربان کرنا کہتے ہیں۔ تاریخی رو میں مسلمانوں کی بے انتہا بد نصیبی کی وجہ بھی ہے۔

(۲) دوسری بات: جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ "ملوکیت" والے اسلام میں جس کا حصہ مقصد اقتدار ہے اور اسلام اس مقصد کے حصول کے ایک ذریعہ کے علاوہ کچھ نہیں، وہیں "امامت" کے اسلام میں اعلیٰ مقصد اسلام ہے جب کہ اقتدار محض استقرار اسلام کا ایک ذریعہ ہے، جس کے وسیلے سے اگر اسلامی خدمات انجام نہ دی جاسکیں تو اقتدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ امام حسنؑ بھی اگر حضرت معاویہؓ کی طرح اقتدار بچانے کی خاطر ہر کام انجام دیتے تو بلاشبہ اپنے لئے "خلیفۃ المسلمين" کا خطاب اختیار کر سکتے تھے۔ مگر جیسے ہی انہیں محسوس ہوا کہ اقتدار کے تحفظ کے بجائے اقتدار چھوڑ کر ہی اسلام سے وفا کی جاسکتی ہے، ویسے ہی اقتدار سے دست بردار ہو گئے، کیونکہ ان کا مقصد اسلام تھا، اقتدار نہیں تھا۔

(۳) تیسری بات: چونکہ امام حسنؑ ایسے دشمن کے مقابلہ پر تھے جو اسلام کا الباہد اوڑھے ہوئے تھا، اس نے صورت حال انتہائی پیچیدہ، مبہم اور غیر واضح تھی، ساتھ ہی جاہلیت کی ایسی تدریجی بغاوت سے سامنا تھا جس کے چہرہ پر اسلام کی نقاب تھی۔ ان حالات میں اس سے مسلح جنگ سے کسی فائدہ کی توقع نہ تھی، لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ نیا انداز بروئے کار لا یا جائے کیونکہ وہ چاہتے تھے، "جاہلیت قریش" کے مکروہ چہرہ پر جو قلی اسلام کی حسین و لفربیب نقاب پڑی ہوئی ہے، اسے تار تار کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ امام حسنؑ محسوس کر رہے تھے کہ ایک چیز ایسی تھی جو معاویہ سے بھی بڑھ کر خطرناک تھی اور وہ تھی "تہذیب معاویہ" یا "ملوکیت"، چنانچہ ایسے اقدام کی ضرورت

تھی جس سے اس 'آمیزش' کا خاتمه ہو جائے اور اسلام اور اصول اسلام ملوکیت اور سیرت سلاطین سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔

اس دور کے حالات اور 'معیار' (یعنی جوہر اسلام) کے مقدار (یعنی مسلمانوں کی تعداد) پر قربان ہو جانے کے سبب سے تہذیب معاویہ کی وسعت کے لئے زمین بالکل ہموار تھی۔ ایسے میں ایسی کارروائی کی ضرورت تھی جس سے معاویہ کی (ظاہری) فتح، تہذیب معاویہ کے خاتمه کی صورت میں ابدی اور دائمی شکست کی آغوش میں موت کی نیند سوجائے۔

امام حسن نے محسوس کیا کہ معاویہ کو فوجی پیلانے پر شکست دینا کافی نہیں ہے اور نہ ہی یہ سیاسی حالات کے اعتبار سے آسان ہے۔ لہذا جو طریقہ طویل مدت میں دائمی طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے، وہ معاویہ کی اصلاحیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ لہذا امام حسن اس نتیجہ پر پہنچے کہ معاویہ کی اصلاحیت کو بے نقاب کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اصلی شکل ظاہر ہو جائے، معاویہ یزید کی شکل اختیار کرے اور 'نقاب پوش نفاق' بے نقاب کفر کی صورت اختیار کر لے، وہ نقی لبادہ تاریخ ہو جائے تاکہ امت اور تاریخ کے لئے فیصلہ آسان اور حق و باطل کا صریح امتیاز ہو جائے۔

امام حسن نے بظاہر معاویہ کی فتح مند ہو جانے دیا تاکہ تہذیب معاویہ کا طسم خود مخوذ ٹوٹ جائے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب یا ڈاکٹر عمل جراحی (سرجری) سے پہلے امراض کے غدوں کو کافی حد تک بڑھ جانے کی مہلت دیتا ہے اور پھر اس کے بعد ایک ہی عمل جراحی کے ذریعہ مرض کی پنج کرنی کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح امام حسن نے اپنی صلح کے ذریعہ ملوکیت کے سرطانی غدوں (Cancerous Glands) کو اپنی انہا تک پہنچ جانے کی مہلت دے دی تاکہ وارث حسن سید الشهداء حضرت امام حسن اپنے ایک ہی عمل جراحی (Surgery) سے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

مندرجہ بالاتین اہم نکات کا غائزہ امام حسن کی صلح کے اسباب کو سمجھنے میں ہمارے لئے کافی ہے۔

امام حسن نے اقتدار چھوڑ کے اسلام کیسے بجا�ا؟

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقتدار معاویہ کا جتنی مقصد تھا اور اسلام مقصد برآوری کا وسیلہ۔ اس کے برخلاف امام حسن کے لئے "اسلام" "مقصد" تھا اور اقتدار اس کا ایک ممکنہ وسیلہ، اس لئے جب آپ نے یہ دیکھا کہ اقتدار میں رہنے سے نہیں بلکہ اقتدار چھوڑ دینے سے اسلام کی حفاظت ہو سکتی ہے تو آپ اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔

اقتدار چھوڑنے سے اسلام کا تحفظ کیوں کر رہتا ہے؟ سب سے پہلے اس نکتہ کی وجہ سے جس کا اشارہ ہم پہلے ہی کرچکے ہیں کہ یہی ایک ایسا طریقہ تھا جس کے ذریعہ حضرت معاویہ کی اصلاحیت سے نقاب اٹھائی جا سکتی تھی اور "تہذیب معاویہ" کے طسم کو توڑا جاسکتا تھا، اس کی وقتی کامیابی ابدی شکست میں تبدیل ہو سکتی تھی اور اس کی تہذیب رسائے تاریخ ہو سکتی تھی۔

وسرے یہ کہ اگر امام حسن بھی اسی انداز میں معاویہ کے مقابلہ آتے تو ممکن تھا کہ عوام "حق" و "باطل" کی اصل جنگ کو سمجھنے سے قاصرہ جاتے اور ممکن تھا کہ تاریخ اس جنگ کو محض "حصول اقتدار" کی ایک جنگ کا نام دے دیتی۔

امام حسن اس جنگ کو "حکومتی جنگ" کے بجائے "عوامی جنگ" کی شکل دے دینا چاہتے تھے، اقتدار سے اقتدار کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ "حقیقت" کے ذریعہ "اقتدار" کی سرکوبی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اسی جنگی حکمت عملی (اسڑیٹی) کا تکملہ کر بلایا ہے۔ امام حسن نے جس جنگ کا آغاز کیا تھا امام حسین نے اسے انجام کو پہنچایا۔ امام حسین نے کربلا میں اقتدار کو اپنے ہو سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح سرگوں کیا کرتاریخ کے کسی بھی دور میں اس کا سراوچا نہیں ہو سکتا۔ یوں تو معزکہ تکر بلائے عظیم ترین مجاہد (ہیرہ) امام حسین تھے مگر جنگی حکمت عملی کا آغاز امام حسن ہی نے کیا تھا۔

ظللم سے مظلومیت اور تکواز سے خون کا مقابلہ

امام حسن نے ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے اسلحہ اور شمشیر کا مقابلہ خون سے کرنے کی بنیاد

رکھی، امام حسینؑ نے اسے نتیجہ کی آخری منزل تک پہنچایا۔ یہ سوچنا درست ہے کہ امام حسنؑ نے صلح کی تھی اور امام حسینؑ نے جنگ۔ مگر امام حسنؑ نے اپنی صلح کے ذریعہ ایسی راہ عمل کا تعین کر دیا تھا جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ تھا جنگ، شہادت اور فتح حسینؑ۔ امام حسینؑ کا عمل امام حسنؑ کی پالیسی کا تسلسل ہے۔ یہ امام حسنؑ ہی تھے جنہوں نے ”ظلم“ کے مقابلے میں ”مظلومیت“، ”شمیشیر“ کے مقابلے میں ”خون“، اقتدار کے مقابلے میں حقیقت اور ”تاج“ کے مقابلے میں ”عوامی جاہدہ“ کا آغاز کیا اور امام حسینؑ نے اسی طے شدہ عمل کو باہم عروج تک پہنچایا۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی اس حکمت عملی سے ایک کثیف حکومت رسوأ ہوئی۔ اس سے بھی اہم یہ کہ اسلام اور نہاد حکومت کی کارستانيوں کے درمیان ایک خط فاصل قائم ہو گیا۔ یہی ہمارے پیشوایان دین کی معركہ آرائی کی سب سے بڑی فتح اور کامیابی ہے۔ یہ کام کسی طرح بھی فوجی اقتدار کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا، نہ ہی اس زمانے کے سیاسی حالات اس کے لئے سازگار تھے۔ امام حسنؑ نے دیکھا کہ فوجی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے حالات کامل طور پر معاودہ یہ کی موافقت میں ہیں۔ اگر غیر متوازن مسلح مقابلے میں وہ اور ان کے رفقاء شہید بھی ہو جائیں تو اس شہادت سے کوئی مغاید پہلو برآ نہیں ہوتا کیونکہ اب تک نفاق کے چہرے پر پڑی ہوئی ناقاب ہٹی نہیں ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ آئندہ کی نسلیں اور تاریخ اس جنگ کو حاکم شام اور حاکم عراق کے درمیان دولت و اقتدار کی ایک عام جنگ سے تعبیر کر کے رہ جائیں۔ اسی وجہ سے امام حسنؑ نے اپنی صلح کے ذریعہ ایک طرف تو اس جنگ کو دو حاکموں کی جنگ کے بجائے ”عوام“ اور ”حکومت“ کی جنگ کی شکل دے دی، دوسری طرف اپنی بچی ہوئی قوت کو محفوظ رکھا تاکہ اظہار حقیقت ہو سکے اور جنگ کی صورت تبدیل ہو کر ”اقتدار“ کے مقابلے میں ”اقتدار“ کے بجائے ”حکومت“ کے مقابلے میں ”عوامی معركہ“ کی صورت اختیار کر لے اور ایک وقت ایسا آئے جب امویوں کے کمرودہ چہرے پر پڑی ہوئی اسلام کی جعلی ناقاب تاریخ ہو جائے اور ان کی اصلی صورتیں بے ناقاب ہو جائیں اور وہی صحیح وقت ہو گا جب شہادتیں کار ساز ہوں گی۔ امام حسینؑ اسی بچی ہوئی قلیل قوت کے ساتھ حکومت

سے ٹکرائے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو حاکموں کی جنگ تھی کیونکہ ”نفاق“ کے مکروہ چہرہ سے نقاب ہٹ چکی تھی، حقیقت ظاہر ہو چکی تھی اور ظلم رسوأ ہو چکا تھا۔ اسی لئے لبنان کے عالم و مجاهد اعظم علامہ شرف الدین نے لکھا ہے: ”عقلمند کی نظر میں روز سا باط (یوم صلح امام حسنؑ) کی فدا کاری کے واقعات روز عاشورا سے زیادہ مستحکم ہیں۔ یوم عاشور کی شہادت پہلے تو حسنی شہادت ہے، بعد میں حسینی ہے کیونکہ یہ امام حسنؑ ہی تھے جنہوں نے تحریک عاشورا کے وجود میں آنے کے لئے راہ ہموار کی اور اس تحریک کے متاثر کو زمانے کے آگے پیش کرنے کے قابل بنایا۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا عمل بتاتا ہے کہ حق و باطل کی طویل مدتی جنگ کا مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ زمان و مکان کے تقاضے سے حکمت عملی اور طریقہ جنگ میں فرق ہوا ہے کیونکہ ہر جنگ کا طریقہ اور نقشہ اپنی اور دشمن کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد مرتب کیا جاتا ہے۔ لہذا کبھی مسلح مقابلہ کا رگر ہوتا ہے اور کبھی اسلامیوں کے مقابلے پر مظلومیت نیز شمشیر کے مقابلے پر خون سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

امام حسینؑ، سید الشہداء

تلوار کے مقابلہ میں 'خون' کے حکمت ساز

امام حسینؑ نے "صلح" کو جتنی حکمت عملی (اُسٹریٹجی) بنایا تھا اور امام حسینؑ نے "شہادت" کو، مگر یہ دوالگ نقشے نہیں ہیں بلکہ انھیں ایک ہی نقشہ کے "دو حصے" سمجھنا چاہئے۔ ۲۱ جھیں معاویہ، یزید کی صورت میں خمودار ہوتا ہے اور امام حسینؑ کی ماہرا نہ تنگی حکمت عملی کے نتیجے میں "نفاق" کے چہرہ کو اپنی آڑ میں چھپانے والی نقاب پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ امام حسینؑ کے لئے یہی موقع تھا کہ براہ راست مقابلہ کر کے یزیدیت کو اپنے خون کے سمندر میں غرق کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

امام حسینؑ نے مقابلہ کیوں کیا؟

اسلام کے خط مستقیم سے اخراجِ کم و بیش پیغمبر اسلام کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ "امامت" کو کنارے کر کے اس کی جگہ "خلافت" نے لے لی تھی مگر معاویہ کے زمانے سے "خلافت" بھی تبدیل ہو کر "سلطنت" کی شکل میں آگئی تھی اور دنیا نے اسلام میں قیصر و کسری کا نظام رانج ہو گیا تھا اور یہ ابوسفیان کا خون اور تہذیب قیصر و کسری کاوارث "خلیفۃ المسلمين" کے نام سے مند خلافت پر قابض ہوا کہ ایک خطرناک تغیری کو جنم دے رہا تھا اور قابل اسلام میں جاہلیت کا زہر پھیلا رہا تھا اور اسے "دین محمدی" کے نام سے پیش کر رہا تھا۔ اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ چند ہی نسلوں میں اصل اسلام، طاق نیاں کی زینت بن جائے گا اور بدکار حکمرانوں کا کردار نمونہ اسلامی سمجھا جانے لگے گا۔

اس خطرے کے احساس سے معاشرہ قطعی بے تعلق تھا۔ اس پر حالات ایسے تھے کہ معاشرے کے اندر "حق" پر "مکاری" کو اور "حقانیت" پر "سیاست" کو فتح حاصل تھی، "عرفان"

پر "جهل" غالب تھا۔ اسلامی قلمرو کے اکثر علاقوں کے عوام جو جواز سے کافی فاصلے پر تھے حقیقت اسلام سے ناواقف تھے، دمشق کے محل میں تخت سلطنت پر ٹھٹھ سے بیٹھنے والے خلیفہ کو وہ مجسمہ اسلام سمجھتے تھے اور اس کے خلاف کھڑے ہونے کو وہ "رہبر اسلامی" کے خلاف بغاوت سمجھتے تھے۔ ججاز، مکہ، مدینہ، عراق اور خراسان کے عوام نسبتاً یادہ آگاہی رکھنے کے باوجود اتنا عی حالت سے خوفزدہ تھے۔ ایک تنہا کوفہ بچا تھا مگر وہ شام کی منظم فوج سے مقابلہ کا متحمل نہ تھا۔ "مرجنی"، "صوفی" اور "جری" جیسے نئے نئے فرقے اور مسلمک اپنے رنگارنگ نظریات و قیاسات کے متعلق عوام کے سامنے طرح طرح کی توجیہیں اور جواز پیش کر رہے تھے۔ ۲۱ جھیں کے دوران تقریباً ایسے ہی حالات کا وجود تھا اور عوام کے ذہنوں کو سلاادینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

امام حسینؑ ان حالات سے مقابلہ، دین کے مورچہ کی حفاظت، اسلام کی اصلیت کے تحفظ، ظلم اور استبداد کو مٹانے اور اسلام کو محل شیخ خلیفہ کے پنجھ سے آزاد کرنے کے لئے حق پرستوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب پیر وابن حق کے لئے باطل کی قوتوں پر فتح پانا ممکن نہ تھا، ظلم کو اس طرح رسو اکرنا کہ وقت کی رفتار کے ساتھ اس کا نام و نشان مٹ جائے، جس وقت فوجی قوت سے بساط ظلم پلٹنا ممکن نہ ہو، اس وقت شہادت اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی اپنی اور اپنے عزیزوں کی زندگی کو قربان کر کے ظلم کو رسو اور ظالم کو بے نقاب کریں۔ لہذا امام حسینؑ نے اسی طریقہ کا انتخاب کیا۔ البتہ امام حسینؑ کے مقابلہ پر اس وقت تین قسم کے گروہ اور تین انداز کے طرزِ فکر تھے:

- (الف) یزیدی - وہ لوگ جو حق کے مقابلہ میں مورچہ بند، بندہ ظلم و جور، صاحبان زر و زور، خود سراور ستمگر لوگوں کے نمائخوار تھے۔
- (ب) گروہ ناصحین و موافقین - جو سمجھوتے، نرمی اور مصلحت اندیشی کے حق میں تھے۔
- (ج) عام لوگ - جو ان معاملات سے بے خبر اور صرف ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

تاریخ میں جب بھی حق و باطل کے درمیان جنگ ہوئی ہے، ہر بار ان تینوں گروہوں کا وجود بھی ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ مذکورہ بالا گروہ دوم سے متعلق تھے انہوں نے امام حسینؑ کو صحیت

کی اور مشورہ دیا کہ وہ مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے یزید سے سمجھوتہ کر لیں، مگر امام حسین شہادت اور قربانی کی راہ کا تعین کر چکے تھے لہذا وہ اسی راہ پر آگے بڑھے اور اپنی امامت کی خصوصیت کو انہوں نے برقرار کھا۔

شکست میں فتح

بے ظاہر کر بلا کی جنگ آدھے دن میں ختم ہو گئی۔ تمام انقلابی شہید ہو گئے سوائے کر بلا کے ان چند پیغمبروں کے جو پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری کا بار اپنے کانہوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ انقلابی شہداء، کر بلا میں اپنے خون میں غلطانِ محظوظ تھے مگر انقلاب بیدار ہو چکا تھا۔ پیروان دین خاک و خون میں لت پت پڑے تھے مگر دینِ نجات پاپکا تھا۔ بے ظاہر یزید کو فتح ضرور حاصل ہوئی تھی مگر تاریخ کی گہرائی میں وہ ایک بدترین شکست خورده انسان تھا اور حسینؑ کو شکستِ ظاہری کی صورت میں ایک عظیم ترین فتح حاصل ہوئی۔ موت نے اپنے ہاتھوں سے انھیں حیاتِ ابدی کا تحفہ پیش کیا۔

حسینؑ اور حسینیوں کے کارناموں کا نتیجہ شکست یا فتح؟

ہر تحریک اور اقدام کی شکست و فتح کو اس کے مقاصد (کی کامیابی اور ناکامی) کے لحاظ سے طے کرنا چاہئے۔ حسینؑ کی شہادت سے یزید کے تین مقاصد تھے۔ پہلا مقصد تھا آوازن حق بلند کرنے والوں کا گلگھوٹ کر صدائے حق کو بادینا، دوسرا مقصد تھا نظامِ اموی اور خاندان ابوسفیان کی ہر خلافت کو کچل دینا، اور تیسرا مقصد تھا ابوسفیان کی نیابت میں "اسلام محمد ﷺ" سے انتقام لینا۔ مگر ان میں سے اس کا کوئی مقصد بھی پورا نہیں ہو سکا اور خون حسینؑ نے نقیباً حق کی فریاد و احتجاج کو پر زور بنادیا۔ شہادتِ حسینؑ تختِ اموی کو متزلزل، اموی سیاسی طاقتلوں کو سوسال سے بھی کم عرصہ میں فنا اور تاریخ میں یزیدیت کو ذلیل و خوار کرنے کا موجب بن گئی اور صدائے حق بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

اس کے مقابلے میں امام حسینؑ کا مقصد "حقیقی اسلام" کو "حکومتی اسلام" سے جدا کر دینا تھا تاکہ یزیدیوں کے عمل کو ایک فاسد حکمران کا کردار ہی سمجھا جائے، اس پر اسلامی نمونہ کا دھوکا نہ ہو۔ امام حسینؑ نے اپنے ارادہ اور اپنے مقصد کو قوتِ بخشی اور سرحدِ اسلام پر اپنے "خون" کی گہری اور انہٹ لکیر کھینچ کر اسلام کو حکمرانوں کے کردار سے جدا کر دیا۔ بہت سے مسلمان یزید سے قبل کے خلفاء کے کردار کو "اسلام کا نمونہ" اور "سد" سمجھتے ہیں، مگر قرباء، حسینؑ نے یزید اور دیگر حکمرانوں کے کردار اور مثالی کردار اسلامی کے درمیان جو بعدِ مشرقین تھی اسے اظہر من اشمس کر دیا، یہاں تک کہ الہامت بھی یزید اور بعد کے خلفاء کے کردار کو مستند نہیں مانتے۔

امام حسینؑ کا مقصد تاریخ میں یزید کو سوا کرنا، حقیقتِ اسلام کا تحفظ اور اسلام کے سچ پیغام کو بطور امانت تاریخ کے حوالے کر دینا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یزید اپنے کسی مقصد میں بھی کامیاب نہ ہو سکا جب کہ حسینؑ اپنی شہادت کے ذریعہ اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہے اور یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ کر بلا کی جنگ میں جسے عظیم ترین فتح حاصل ہوئی، وہ حسینؑ تھے اور جسے بدترین شکستِ نصیب ہوئی اور جو نیست و نابود ہو گیا وہ یزید تھا نیز یزیدیت تھی۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جو فتحیاب ہوتا ہے، وہ پیشان نہیں ہوتا اس کے بر عکس جو شکست کھاتا اور نقصان اٹھاتا ہے وہ حسرت اور پیشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم تاریخ سے پوچھتے ہیں کہ پیشان کون ہوا: حسینؑ یا یزید؟ یہ معکر کہ صحرائے کر بلا میں فتح و شکست کے تولے کا ایک معیار ہو سکتا ہے۔

ابھی کر بلا کی جنگ کو زیادہ عرصہ نہیں گذراتھا کہ یزید نے اسیران کر بلا کو مدینہ واپس بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دمشق اور جہان اسلام کے تمام اطراف و جوانب میں شہیدوں کے لہو کے قطروں سے انقلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ اسیران کر بلا کی واپسی یزید کی پیشانی اور احساس شکست کی علامت ہے۔ زینبؓ و سجادؓ کی خواہش ہے کہ یادِ حسینؑ و یادِ کر بلا ہمیشہ زندہ رہے جبکہ یزیدی چاہتے ہیں کہ "کر بلا" جلد از جلد ذہنوں سے محو ہو جائے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ شہیدوں کے خون کی طغیانی میں انہیں اپنی فتح تکے کی طرح بہت اور

خطرناک امواجِ شکست اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

واقعات کر بلاؤ بھی پانچ برس بھی نہ گذرے تھے کہ یزید و اصل جہنم ہوا اور اپنے باپ اور دادا کے تخت پر یزید کا پیٹا معاویہ آیا۔ اس کے برسر اقتدار ہوتے ہی خاندان ابوسفیان کی سلطنت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ مروان اور اس کی اولاد نے زمام حکومت سنبھالی۔ مگر انہیں نئے انقلابات کا سامنا کرنا پڑا اور تمام تحریکوں کو لے کر اٹھنے والوں کا نعرہ تھا: ”انتقام خون حسین“، چنانچہ انقلاب مختار، قیام ابراہیم، قیام توایین و سلیمان بن صرد خزادی وزید و تیکی وغیرہ نے اموی حکومت کو لرزہ براندام کر دیا یہاں تک کہ سوال سے بھی کم عرصہ میں بنی امیہ کا خاتمه ہو گیا اور اس کی جگہ حسین اور طلبگار ان انتقامِ خون حسین کے نام پر عبادی برسر اقتدار آگئے۔

امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟ اس لئے کہ امت کو بیدار کریں۔ امام حسینؑ اپنی سچائی کے ذریعہ اور اپنا خون بہا کر امتِ اسلامی کو خواب غفلت سے چونکا ناچاہتے تھے، کربلا کے واقعات سے پہلے لوگوں کی بے تعلقی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جمعہ کی نماز خلیفہ نے بدھ کے روز پڑھوائی اور سکھوں نے پڑھی، مگر کربلا کے بعد یہ تمام انحرافات اور تحریکیں سوال سے بھی کم عرصہ میں ختم ہو گئیں۔

کربلا میں خون کا ایک دھماکہ ہوا اور اس عظیم دھماکہ کی لہروں نے تمام قلمرو اسلامی میں پھیل کر ایک لرزہ پیدا کر دیا۔ عرصہ تاریخ میں یزید کو سوا کیا یہی نہیں بلکہ اس عظیم دھماکہ سے تاریخ کے سنگلاخ سینہ سے ایسا چشمہ پھوٹا جس کی روائی سے اسلام ہمیشہ ہمیشہ کسبِ حیات کرتا رہا گا۔

تاریخ میں کربلا کا دوام:

ہابنل اور قابنل کی طاقتلوں میں تصادم

موئی و فرعون و شیئر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

(علامہ اقبال)

اسلام حسین کا اعتقاد تو حید اور قیامت پر ہے دنیا کے سلسلے میں خالق کے شعور، ارادہ اور مقصد کا بھی قائل ہے اور ”وحدتِ تاریخ“ کو بھی مانتا ہے۔ تاریخ گذشتہ واقعات کا ایسا مجموعہ ہے جو اتفاقی طور پر پیدا ہو کر ختم نہ ہو جانے والی ہے بلکہ واقعات کا ایک تسلسل ہے جو چیز رواں ہے جیسے ایک کارروائی، ایک چشمہ جو انسان کی زندگی کے آغاز کے ساتھ جاری ہو اور ایک مستقل روانی کے ساتھ مخصوص سمت میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس چشمہ امر و فردا میں ہر گز را ہوا ”کل“، ایک ”آج“ کو جنم دیتا ہے۔ ہر حال ماضی کے پیٹ میں رہتا ہے اور ہر ماضی حال کی ”پیٹھ پر“ ہوتا ہے۔ روئے زمین پر تاریخ انسان کے ساتھ حرکت کرتی ہے اور جو قدر یہی تاریخ پر حکمرانی کرتی ہیں انھیں ”سننِ الہی“ کہتے ہیں۔ ان ”سننِ الہی“ میں ایک یہ بھی ہے کہ ”حق“ ہمیشہ ”باطل“ سے نبرد آزم رہتا ہے، ”علم“، ”جهل“ سے برسر پیکار رہتا ہے۔ ایمان کفر سے مصروف جنگ رہتا ہے اور انحراف سے بیادِ الہی کی کشاکش جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ آدم سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد سے تاریخ، کشاکش ہابنل و قابنل کے محور پر گھومتی رہتی ہے۔ ہر دور ہر عہد اور ہر جگہ میں حق انبياء و مونین کی سرکردگی میں باطل کے تاجداروں سے مصروف پیکار رہا ہے۔ ابراہیم و نمرود، موئی و فرعون، اور محمد ﷺ و ابوالہب و ابو جہل و ابوسفیان۔ یہ تمام مرحل ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں، یہ

جنگ ایک گزر جانے والی جنگ نہیں بلکہ ایک تاریخی تسلسل ہے جو ہر دور میں دھرا یا جاتا ہے۔ ”حق“، ”باطل“ کی یہ جنگ فلسفہ تاریخ کا رخ اسلام کی سمت موڑتی ہے۔ چنانچہ کربلا اس جنگ کی ایک عظیم تجلی اور نمایاں میدان ہے۔ جس نے ”حق“، ”باطل“ کی جنگ کے ایسے پہلو اجاگر کئے ہیں کہ اس کے بعد سے ہونے والی ہر جنگ ”حق“، ”باطل“ کو کربلا سے منسوب کیا جانا چاہئے، کربلا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو تاریخ بشر کے آغاز کے ساتھ جاری ہوا اور جو حال کو اپنی پیش میں لیتا ہوا مستقبل کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے۔

حسینؑ، رومنی تاریخ کے وارث

”زیارت وارث“ درحقیقت فلسفہ تاریخ کے بارے میں شیعی نقطہ نظر کا اعلان ہے۔ یہ زیارت پکار پکار کر کہتی ہے کہ حسینؑ ایک فرد نہیں بلکہ پیوستہ تاریخ کی رومنی کے وارث ہیں۔ حسینؑ اس پرچم کے وارث ہیں جو تاریخ بشری میں باطل، ظلم، زور، انحراف اور جاہلیت کی قدروں کے خلاف ہونے والی جنگ میں ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا حسینؑ تک پہنچا ہے۔ وہ وارث آدم، وارث نوح، وارث ابراہیم، وارث موسیٰ، وارث عیسیٰ، وارث حضرت محمدؐ، وارث علیؑ اور وارث حسنؑ ہیں۔ اگر قرآنی صفحات کا مطالعہ کر کے دیکھا جائے کہ ہائیل، نوح، ابراہیم اور موسیٰ کن تدریوں کے علمبردار تھے اور کن قوتوں اور قدروں کے خلاف مصروف و غاثتھے تو معلوم ہو گا کہ ہر دور میں نسبتاً کمتر مگر ایک کربلا کا وجود تھا۔ زمانے کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے جب ہرم قم کے عظیم مظاہرہ اور یہ ارشیروں کی کامیابیوں اور خونین شہروآبادان کے مناظر تک پہنچتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ”کل“، کی کربلا کھنچ کر ”آج“ کے حالات میں ڈھل گئی ہے اور ہم یہ مان لیتے ہیں کہ کربلا کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور کربلا کی تکرار ہر دور میں ہوتی رہے گی۔

نظائر ابراہیمؐ، موسیٰ اور حسینؑ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، مگر حسینؑ برہ راست آدمؐ، ابراہیمؐ، موسیٰ اور عیسیٰؑ کے وارث ہیں اور نمرود و فرعون صرف اپنی قوت کا استعمال کرنے

والے ہیں جو ان انسانوں کو جنحیں صرف خدا نے واحد کے آگے جھکنا اور اس کی عبادت کرنا چاہئے، اپنے آگے جھکنا چاہئے ہیں اور ان سے اپنی پرستش کروانا چاہئے ہیں۔ موسیٰؑ اسی اصول کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور فرعون سے ٹکرائے تھے تاکہ انسانوں کو طاغوت کی بندگی سے نجات دلائیں۔ لہذا موسیٰؑ نے دربار میں فرعون سے مطالبہ کیا:

”أَنْ أَفْوِ الْيَّةَ عِبَادَ اللَّهِ إِنَّى لَكُمْ رَسُولُ أَمِينٍ“ (سورہ دخان، آیت: ۱۸) [بندگان خدا کو مجھے واپس کر دے، میں تیری طرف بھیجا ہوا خدا کا امین ہوں۔]

”أَنْ عَبَدْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ“ (سورہ شعراء، آیت: ۲۲) [تو نے بھی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے۔] حسینؑ بھی ظلم و جور، قوت و اقتدار کے خلاف نبرد آزمائوئے اور ایک عظیم حکومت کے خلاف تن تھا کھڑے ہو گئے۔ گویا حسینؑ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارے پاس دین نہیں ہے تو کم سے کم دنیا میں تو آزاد ہو۔

آج بھی انسان کی مختلف طاغوتی طاقتیں، مشرقی اور مغربی سامراجیت کی شکل میں، ریگن، برٹنوف اور صدام کی صورت میں کمزور قوموں کو جو یزید کے زمانے کے مسلمانوں اور بنی اسرائیل کی مانند ہیں، اپنے شکنہ میں جکڑے ہوئے ہیں اور حسینؑ طاقتیں یزید ان زمانے سے بر سر پیکار ہیں۔ بیرونی حسینؑ میں مانگیں اپنے کمسن اور جوان یعنی غلامان علیؑ اکبر و علیؑ اصغر کو اسلام پر قربان کر رہی ہیں۔ آپ غور کریں کہ آبادان اور خونین شہر میں حق و باطل کے درمیان محاذ جنگ پر کیا ہو رہا ہے؟

موسیٰؑ کے مقابلہ میں فرعون کا رسول کیا تھا؟ مادی طاقتیوں کے ذریعہ حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کرنا: ”ذَرْ ذُنْنِي أَقْتَلُ مُؤْسِي وَلِيُدْعَ رَبَّهَا إِنَّ أَخَافُ أَنْ يَنْدَلِي دِينِكُمْ أَوْ أَنْ يَظْهَرَ فِي الْأَرْضِ الْفُسَادُ“ (سورہ مومن، آیت: ۲۶) [فرعون نے کہا: ”چھوڑ دو میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں، مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آیا وہ تم لوگوں کو نئے نظریات اور نیا عقیدہ دیتا ہے یا زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔] امام حسینؑ بھی اسی رسول سے دوچار تھے۔

ناخالتواریخ کے مطابق:- یزید نے والی مدینہ ولید کو لکھا: ”اگر حسین بن علیؑ بیعت نہ کریں تو اس خط کے جواب میں ان کا سر میرے پاس بھیج دو“، جس وقت حسینؑ، یزید کے والی، ولید کے سامنے تھے، مروان نے کیا کہا؟ اس نے کہا: ”حسینؑ پر نظر رکھوتا آنکہ یا تو وہ بیعت کریں یا ان کا سر قلم کر دو“ (۱) جواب میں امام نے کہا: ”وَيَلَّكَ يَا أَبْنَى الْزَّقَافَ، أَنْتَ تَأْمُرُ يَصْرِيبُ عَنْقَنِي كَذَبَثَ وَلَوْمَثَ“ یعنی ”اے ناپاک اور گندی اولاد! تو میری موت کا حکم دیتا ہے؟ خدا کی قسم تو نے جھوٹ کہا اور اس کے لئے تجھے ملامت بھگتی پڑے گی۔“ (۱)

یزیدوں، فرعونوں، ریگنوں، آریا مہروں اور صد اموں کا یہی شیوه مشترک ہے کہ اسلحہ کے زور پر نقیباں حق کو خاک و خون میں غلطان کر دیتے ہیں تاکہ وہ موجودہ حالات کو اپنے موافق نہ بنائیں اور اسے وہ فساد اور بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ اس کی واضح اور آشکار ترین تصویر کربلا میں پیش کی گئی۔ حسینؑ نے خون کے طاق تو رطفان سے دشمن کے اسلحے اور رثوت، اقتدار اور خیر سری کی اس تاریخی منطق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس حسینؑ کو گزرے چودہ سو برس ہو گئے مگر آج بھی جب کبھی کبھی حق باطل سے ٹکراتا ہے تو باطل اسی اصول پر کار بند ہوتا ہے اور پاساں حق بھی مجازِ جنگ پر شجاعت کر بلاد ہراتے ہیں اور خون کے زور سے شمشیر پر فتح حاصل کر کے پیروی حسینؑ کرتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کے دھارے پر کربلا کا تسلسل قائم رہتا ہے۔

فرعون کے متعلق قرآن کہتا ہے: ”بَعَلَ أَهْلَهَا شِيعَائِيْسَ ضَعِيفٌ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ“

(سورہ قصص، آیت: ۲۴)

”فرعون کے خاص جرائم میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ انسانوں کو نسلی اعتبار سے تقسیم کرتا تھا اور گروہوں کو دبائے رکھتا تھا۔“

۲۱۷ میں امام حسینؑ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جاہلیت کی بنیادیں، قومی اور قبائلی عصبیتیں دوبارہ سر اٹھا رہی تھیں۔ امتِ اسلامی کے کمزور افراد ظلم و استبداد کا شکار تھے۔ ایسی صورت میں امام حسینؑ بھی حضرت موسیؑ کی طرح اس صورت حال ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱) ناخالتواریخ، حالات سید الشہداء، ص ۱۵۶

یہ حقیقت ہے کہ امام حسینؑ آدمؑ نوع دبر ایمیم و موسیؑ کے وارث تھے۔ لیکن کیا آج امریکہ، روس اور ان کے نمک خواروں کی سامراجیت کا مجرمانہ طرزِ عمل کچھ مختلف ہے؟ ایسے موقع پر وارثانِ مشعل کر بلاؤ اور پیر و اون حسینؑ آج بھی خمینی یا ان کی طرح باطل قوتوں سے ٹکرار ہے ہیں۔ یہ ہے تاریخ کے امروز پر کربلا کی تکرار اور کربلا کا تسلسل۔

یزیدوں، فرعونوں اور نرمودوں کے عمل کے جواب میں حسینؑ، موسیؑ، ابراہیمؑ اور ان کے پیر ووں کا رویہ ایک ہی ملک سے ماخوذ رہا ہے یعنی ”لا“ اور ”الا“، ”ہاں“ اور ”نہیں“۔ ہر ”زور“، ”ستم“، ”باطل“ اور ”طاغوت“ کے مقابلے پر ”نہیں“ اور ”خدا“، ”حق“، ”انصاف“ اور ”سچائی“ کے سامنے ”ہاں“۔

حق کے انہیں علمبرداروں کی ”نہیں“ تاریخ کی جان اور قوت کا سبب رہی۔ یہی ملکی ”نہیں“ اور ”ہاں“ تھی جو زندگی میں تحرک و روانی قوت کا سبب بن گئی۔ ان حق کے علمبرداروں کے ہاتھ میں ”نہیں“، وہ شمشیر تھی جس نے زندگی کے تمام سماجی، سیاسی اور مذہبی بد مختیوں کو جڑ سے ختم کر دیا..... پیغمبر اہنے ”ہاں“ ہمیشہ ایک ”نہیں“ کے ساتھ ہوتی ہے۔

حسینؑ کا انکار اور ”نہیں“، موسیؑ اور ابراہیمؑ کی ”نہیں“ ہے۔ یہیں تو حیدر کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔ اس میں ”ہاں“ بننے کا امکان نہیں پایا جاتا اس لئے کہ اگر یہ ”نہیں“، ”ہاں“، ”بن جائے تو جتنی چیزیں برا سیوں کی نفعی کرتی ہیں وہ سب اثبات میں بدل جائیں۔ ”نہیں“ تمام جعلی ناقابوں کو تاریخ کر کے اصل حقیقت کو جلوہ گر کرتی ہے۔ انسان اور عالم کا ارتقا بغیر اس ”نہیں“ کے ممکن نہیں ہے۔ آدمؑ کے وارث حسینؑ سے جب ابن زیر نے پوچھا کہ اگر یزید بیعت کی دعوت دے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ”میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔“ (۱) آپ نے محمد حنفیہ سے مخاطب ہو کر اعلان فرمایا: ”یا آخری وَ اللَّهُ لَوْلَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا مُلْحَاظًا لَا مَأْوَى لَمَّا يَأْتِ“ یہ نہیں دینا بین معاویۃ۔

(۱) کامل ابن اثیر، ج اص ۷ طبع مصر ۲۰۱۳ء

[خدا کی قسم اگر میرے لئے ساری دنیا میں کہیں بھی امن اور پناہ کی جگہ نہ ہوتی بھی میں فرزند معاویہ کے ہاتھ پر ہرگز ہرگز بیعت نہ کروں گا۔]

حسینؑ کے اس انکار اور اس نہیں نے تاریخ کی بیکراں فضاؤں میں ابتدک کے لئے ایک گونج پیدا کر دی ہے۔ ”نہیں“، یعنی باطل، طاغوت، انحراف اور ہر اس چیز، ہر اس قوت کے مقابلے میں احتجاج جو حقیقت اور خدا سے مکراتی ہے اس کے بعد ”ہاں“، یعنی صرف خدا کے حضور میں اور مشائے الہی کے آگے اقرار۔

”ہاں“ اور ”نہیں“، یعنی ”اقرار“ و ”انکار“ کی یہی منطق ہے جو زندگی کو الکٹران (neutron) اور نیوٹران (electron) کے ابتدائی مراحل سے لے کر روحانی اور معنوی مراحل کی بلندیوں تک انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور حیات انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔

واقعہ کربلا کے چودہ سو برس کے بعد آج بھی نسلِ حسینؑ کا ایک نائب امام و رہبر زمانے کے یزیدوں کے مقابلہ میں اسی ”نہیں“ کی تکرار کر رہا ہے۔ اس ”نہیں“ میں ایسا یقین ہے کہ جو بڑی بڑی جابر حکومتوں کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ حسینؑ کی پیروں ملت ایک سیسے پلائی ہوئی دیوار ”کائنہ بنیان مَرْضُوض“ ہے جو شرقی و مغربی قوتوں کے مقابلہ پر کھڑی ”نہیں“ کی تکرار کر رہی ہے اور نسلِ حسینؑ کا اپنے قبیلہ کی سنت سے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ کربلا پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ فرعون قسم کے لوگ علمبردارانِ حق کی حکم حکمت عملی اور ان کی کامیابیوں کے خلاف طرح کے بہتان، تمہیں اور الازمات تراشتے ہیں۔ موسیٰ کو فرعون نے کبھی ”ساحر کذاب“ کہا، کبھی ”اَنَّهُ لَمْ يَخْنُونَ“ یعنی دیوانہ اور کبھی با‘ فساد ٹھہرایا۔ یزید بھی وارثِ موسیٰ حسینؑ کو بااغی، فسادی اور ہنگامہ ساز وغیرہ مشہور کرتا ہے اور چودہ سو برس بعد آج بھی علمبردارانِ حق کو جن اتهامات والزمات کا سامنا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں باطل کے اصولِ جنگ، حربوں اور طریقہ کار میں سابقہ مماثلت باقی ہے اور زمانے کی تبدیلی بھی اس میں کوئی فرق نہ پیدا کر سکی۔

حالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ یہ فرعونی حکمرانی کا دور ہے۔ اس کے قلمرو میں ہر ظلم و ستم اور خود پرستی کی حکمرانی ہے۔ اس نے لوگوں کی آزادی سلب کر رکھی ہے اور نقیبِ حق موسیٰ کو مصر سے بھارت پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

”فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبُّ نَجَنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔“

(سورہ قصص، آیت: ۲۱)

اور اب یزیدی دور ہے، اسلامی قلمرو میں ایک بار پھر ظلم و ستم، غصب اور غارتگری کا دور دورہ ہے، یزیدِ حسینؑ سے بیعت کا طبلگار ہے اور حسینؑ فیصلہ کن انداز میں ایک بار ”نہیں“، کہتے ہیں۔ یزید امام وقت کے قتل کا حکم صادر کرتا ہے اور امام وقت اپنی عورتوں اور معصوم بچوں کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر مکہ آنے پر مجبور ہے۔

یزید نے کیا کیا؟

”فَأَرَسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ إِنَّ هُؤُلَاءِ لَشَرُّ ذِمَّةٍ قَلِيلُونَ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِطُونَ وَإِنَّا لَجَمِيعَ حَادِرُونَ۔“

(سورہ شراء، آیات: ۵۲-۵۳)

انبیاء کی تحریک کے مقاصد میں ایک مقصد انحراف کے تسلط سے بچاؤ تھا۔ زمانہ میں جب مختلف مضرت رسان اسباب کے نتیجہ میں انسانیت کا قافلہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے تو ایسے حالات میں خدا کے بھیجھے ہوئے رسولوں میں سے ایک جہاد کا آغاز کرتا ہے تاکہ دینِ الہی کے منور اور شفاف چہرے پر پڑے ہوئے فساد اور انحراف کے داغ دور کر دے۔

جس وقت امامِ حسینؑ نے تحریک کربلا کی ابتدکی، اس وقت خدا کا آخری کامل ترین دین اسلام انحراف کے دہانے پر کھڑا تھا۔ مندِ خلافت پر یزید کا قبضہ تھا، وہ ”خلیفہ“ کے نام سے مسلمانوں کا دینی رہنمائنا تھا اور اس کا ہر عمل تمام مسلمانوں کے لئے مثالی اور نمونہ سمجھا جاتا تھا اور یہ خطہ سر پر منڈلارہا تھا کہ کسی وقت بھی صحیح اسلام کی صورت بدل جائے گی۔ ایسی صورت میں حسینؑ

چاہتے تھے کہ اپنا خون، علیٰ اکبر، علیٰ اصغر، قاسم و عباس کا خون نیز زینب و ام کلثوم کی چادر دے کر، غرض کے سی بھی قیمت پر ”خلافت“ کے نام سے موجودہ حکومت کو اس طرح رسوایا جائے کہ اگر وہ مٹ نہ بھی سکے تو کم از کم خلیفہ کو مسلمانوں کا ”دنیٰ خلیفہ“ کسی طرح نہ مانا جائے اور خلیفہ کی شخصیت اسلامی تعلیمات سے قطعی الگ ہو جائے۔ حسینؑ کو اپنے اس مقصد میں زبردست کامیابی ہوئی۔ یزید سے پہلے خلفاء تھے حتیٰ کہ معاویہ تک مثالی اور نمونے سمجھے جاتے تھے، مگر یزید اور اس کے بعد کے خلفاء اسلامی تعلیمات سے اس قد ر مختلف نظر آنے لگے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں جو نکاہ احترام سے انھیں دیکھے۔ معز کہ کربلا کا یہ ایک عظیم ترین کارنامہ تھا۔ حسینؑ نے حکومتی اسلام کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تاکہ ”اسلام محمدی“، ”محفوظ و مستحکم“ رہے۔

سرداد و نہ داد دست در دستِ یزید

حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

کربلا کی برکت سے اس میدان میں حسینؑ کا کارنامہ کو دوام حاصل ہے۔ جس دور میں بھی یہ احساس ہوا ہے کہ اصل اسلام فراموش ہو رہا ہے، علمائے اسلام تحفظ اسلام کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لئے میدان میں آگئے ہیں۔ آج بھی ملک خالد جیسوں کے اسلام کے ذریعہ سے بذریعہ یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ اصل اسلام فراموش کر دیا جائے گا۔ ملک خالد جیسوں کے اسلام اور رابطہ العالم الاسلامی کو دنیا کے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا گیا مگر امام خمینی کی سرب رہائی میں ایران کے عظیم انقلاب نے اچانک اس طلسم کو توڑ دیا اور دنیا کو دھایا کہ امریکی اسلام اس اسلام محمدی اور اصل اسلام سے مختلف ہے جس کے نگہبان حسینؑ تھے۔ ثروت و نخوت اور ریا کاری کا اسلام اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام وہ ہے جو کمزوروں کا حامی ہو اور مشرق و مغرب کی قوتیں سے مقابلہ کرنے والا ہو، ان کا خادم نہ ہو۔

سچ تو یہ کہ کربلا کا اثر بھی باقی ہے۔-----

حسینؑ کے مقصد سے متعلق محمد بن حفیہ کے نام حسینؑ کی وصیت ایک زندہ اور بوقتی سند

ہے جس میں انہوں نے اپنے اصل مقصد کی تفصیل اور کامل حکمت عملی کی تشریع کی ہے۔ وصیت نامہ یہ ہے:

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ هَذِهِ مَا وَصَّى بِهِ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلَىٰ بْنِ أَبِي طَالِبٍ الْأَعْرَجِ مُحَمَّدٌ الْمَعْرُوفُ بِالْحَنْفِيَةِ إِنَّ الْحُسَيْنَ يَشْهَدُ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا شَرِيكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا أَخْبَدَهُ وَرَسُولُهُ جَاءَ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِ الْحَقِّ وَإِنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ وَإِنَّ السَّاعَةَ أُتْيَتُهُ لَا رَيْبٌ فِيهَا وَإِنَّ اللَّهَ يَعِثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ وَإِنَّ لَمْ أَخْرُجْ أَشْرًا وَلَا بَطْرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا وَأَنَّمَا أَخْرُجْتُ لِتَطْلِبَ الْإِصْلَاحَ فِي أَمْمَةِ جَدِّي (ص) أَرِيدُ أَنْ أَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَسْيِرُ بِسِيرَةِ جَدِّي وَأَبِي فَمَنْ قِيلَىٰ بِقَبْوُلِ الْحَقِّ فَاللهُ أَوْلَىٰ بِالْحَقِّ وَمَنْ رَدَ عَلَىٰ هَذَا أَصْبَرْ حَتَّىٰ يَقْضِيَ اللَّهُ بَيْنِي وَبَيْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔“^(۱)

[میں حسینؑ ابن علیؑ یہ وصیت اپنے بھائی محمد بن حفیہ کے نام کر رہا ہوں۔ خدا کی یگانگی اور وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور میں اعتراض کرتا ہوں کہ بہشت اور دوزخ حق ہیں اور قیامت کے دن خداب کو اٹھائے گا۔ باطل کے مقابل میں قیام کا مقصد راحت طلبی یا آرام نہیں ہے بلکہ میرا مقصد امت کی اصلاح اور معاشرے کو انحراف سے بچانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ”اچھائیوں“ کی ہدایت کروں اور ”برائیوں“ سے باز رکھوں، میرا شیوه میرے نانا اور میرے والد علیؑ کی مانند ہے۔ لہذا جو میرے مقصد اور میرے لائے عمل کو جان لے اور میرے ساتھ تعاون کرے، وہ سعادت پائے گا اور جو اس کو رد کرے تو میں تحمل کروں گا یہاں تک کہ خداوند عالم میرے اور میری قوم کے درمیان صحیح فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔]

امام حسینؑ کے بعد کربلا کا تسلسل

اس وصیت میں امام حسینؑ نے صریح طور پر اپنے جہاد کی وجہ اصلاح امت اور اس کی خیر

(۱) بخار الانوار، ج ۱ ص ۲۷۸ ایشون چاپ، اسلام

وسعادت کے حصول کو بتایا ہے۔ حسینؑ اپنے مقصد کو نبی عن المکر بتاتے ہیں۔ منکر کیا ہے؟ وہ کس چیز سے روک رہے ہیں؟ اندر ورنی طور پر اسلام کا دگر گون ہونا۔ کمزوروں کے اسلام کو طاقتوروں کے اسلام میں، اصلی اسلام کو چالو اسلام میں اور رباني حقیقوں کو سامراجی ڈھروں میں بدلنا۔

خدائی اسلام کی حقیقت کے تحفظ کے لئے امام حسینؑ اور ان کے رفقاء اپنی اور اپنے اعزاز کی جانبیں قربانی کے لئے پیش کرتے ہوئے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس راہ میں موت ان کے لئے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے، نیز شمشیر کے سایہ میں وہ ”حقیقت“ اور ”اصلیت“ کے روئے زیبا کا نظارہ کرتے تھے۔ انہوں نے وہ عمر کے کئے جن سے کربلا کے بعد بھی ان گنت کربلاوں کے معمر کے سر ہوتے رہیں گے۔ اگر ہم ان واقعات کا پیغم خود نظارہ کرنا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ محاذ جنگ کا معائنہ کریں، اسلام کے جانشیروں کے خیموں کو دیکھیں اور مجاہدوں کے معمولی گھروں میں جائیں اور دیکھیں کہ کس طرح کربلا کا تسلسل جاری ہے اور امام حسینؑ کے وصیت نامہ میں واضح کئے گئے مقصد کے لئے مجاہدوں اور شہیدوں کے قافلے پر قافلے اپنی منزل مقصود یعنی محاذ جنگ پر موت کو گلگلے لگانے کو کس طرح یکے بعد دیگرے روائیں اور کس طرح گولیوں کی بوچھار میں ”اللہ اکبر“ کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حسینؑ کی پیری میں اپنے خدا سے وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ اسلام کی حفاظت کریں گے اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک اس عہد پر باقی رہیں گے۔ کس طرح مائیں غلامان علی اکبر و علی اصغر کو اسلام پر شمار کر رہی ہیں اور کس طرح زینب کی پیر و مہنیں شہزادی کی طرح اسلام کے لئے جانشی اور فدا کاری پر آمادہ ہیں۔

یہ ”کل یوم عاشورا او کل ارض کربلا“ کا مفہوم ہے۔ کربلا گذر اہوا واقعہ نہیں جو لاہور میں واقع ہوا ہو، کربلا مستقل روانی کا نام ہے، کربلا ایک دائی جنگ ہے، ہر زمانے اور ہر علاقے میں یزیدی قوتیں حق کے علمبردار اور پیروان حسینؑ کے مقابل صفت آ را ہوتی ہیں اور حق و باطل کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ حسینی راہوں کے پیرو وہ لوگ ہیں جو حق و باطل کی جنگ میں علاشریک ہوتے ہیں، باطل کے خلاف سورچہ بندی کرتے ہیں، روشن اور قطعی

سیاست اختیار کرتے ہیں اور تحفظ حق کی غرض سے اپنی جان، مال و متعاع سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ دسویں محرم ہی کو کربلا ختم نہیں ہو گئی اور نہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ کربلا ختم ہو گئی ہے اور اس جنگ کے عظیم مجاہدین مردہ ہیں، نہیں حسینؑ، عباسؑ، علیؑ اکبرؑ، اور حرس کے سب زندہ ہیں۔ ہر زمانے میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ ہمیشہ اس جنگ اور میدان جنگ کے واقعات کو دہرا یا کرتی ہے۔ ایک فرزانۃ اسلامی نے کس قدر سچی بات کہی کہ ”جب یہ حکم دیا گیا کہ حضرت عباسؑ کے روٹے پر سرخ جھنڈا الہرا دیا جائے تو اس کا کیا مطلب تھا؟ یہی کہ جنگ جاری ہے اور پرچم اپنی جگہ پر ہے۔ آج اگر یزید نہیں ہے تو کیا ہوا، اس کی جگہ صدام ہے، سادات ہے اور ان کے علاوہ بھی لا تعداد چھوٹے بڑے یزید موجود ہیں اور جب تک ان کا وجود ہے حسینیوں کو چین سے نہیں بیٹھنا چاہئے یہ جو پرچم تمہارے ہاتھ میں ہے یہ محض عباسؑ کا پرچم نہیں ہے بلکہ یہ وہ پرچم ہے جو تاریخ کی ابتداء سے دست بدست ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ لوگ کتنے احمق تھے جنہوں نے یہ سمجھا کہ یہ پرچم فرات کے کنارے گر چکا ہے، پرچم تو اپنی جگہ الہرا دیا ہے اور جنگ ایکی جاری ہے۔ کربلا کا تسلسل جاری ہے ہر سال محرم ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ”جانباز آگے بڑھو، مشعل کر بلاگرنے نہ پائے۔“

النصار حسینؑ کی شجاعت

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام معمر کہ کربلا میں شجاعت کے اصلی مظہر ہیں، لیکن ان کے پرچم تلتے بہادروں کا ایک کارروائی نظر آتا ہے۔ افق تاریخ پر سید الشہداء ابدر کامل کی طرح چمکتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے چمکتے ستارے ہیں جو تاریخ کے اس عظیم معمر کے علمبردار اور شہر حق، عدالت اور الہی سنتوں کے محافظ تھے۔

النصار حسین کے سلسلہ میں اس جگہ مولانا سید علی نقی صاحب کی کتاب ”شہدائے کربلا“ سے خلاصہ پیش کر رہا ہوں جو پاکستان میں شائع ہو چکی ہے۔^(۱) یہاں پر معمر کہ کربلا کے بہادروں کا (۱) یہ ہندوستان میں امامیہ مشن، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ مترجمہ

فہرست وارتد کرہ کیا جائے گا۔ شہداء کا ذکر ان کی ترتیب شہادت کی بنیاد پر ہے۔ روز عاشورا اسی ترتیب سے شہداء کیے بعد دیگرے میدان میں تشریف لائے اور انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ضمناً یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ شہداء کی تعداد کے بارے میں تاریخوں میں اختلاف ہے۔ ہم ان تمام شہدا کا ذکر کریں گے جن کا نام تاریخوں میں آیا ہے اور جو مقاتل اور روضہ میں مذکور تعداد ۲ کے سے کمیں زیادہ ہے۔

کربلا میں پہلا شہید کون تھا؟

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کربلا میں شہید ہونے والے پہلے مجاہد حرب ابن یزید ریاحی تھے۔ ”مناقب“ میں ابن شہر آشوب بھی نظریہ ہے اور اکثر کتب ”مقاتل“ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ سپہر کا شانی اپنی ”ناجح التواریخ“ میں اس بات کو مانتے ہیں کہ جناب حرس سے پہلے عبد اللہ بن عمر کبھی شہید ہوئے۔ لیکن یہ دونوں نظریے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ طبری کی تحریر کے مطابق عبد اللہ بن عمر پہلے شخص تھے جو یزیدی لشکری کے دوسرا ہیوں یا سارا اور سالم کی مبارز طبلی کے بعد میدان میں تشریف لائے اور دونوں کو اصل جہنم کیا لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر اس موقع پر شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنے لشکر میں واپس آگئے اور بعد میں شہید ہوئے۔ طبری نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابن شہر آشوب نے ابن عمر کو حملہ اولیٰ کے شہیدوں میں لکھا ہے یہ حملہ ظہر سے پہلے ہوا تھا۔ ”ناجح التواریخ“ میں مولف ایک جگہ عبد اللہ بن عمر کو روز عاشورا کا سب سے پہلا شہید بتاتے ہیں۔ اسی کے بعد ابن شہر آشوب کی پیروی میں شہداء کے سلسلہ کو جناب حرس سے شروع کرتے ہیں جو مولف ”ناجح التواریخ“ کے اچھی طرح غور و خوض نہ کرنے کا نمونہ ہے۔ اس کتاب میں اس طرح کے بہت سے نمونے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں پہلے شہید مسلم بن عوجہ اسدی ہیں۔ ہم شہداء کے سلسلہ کو انہیں سے شروع کرتے ہیں۔

مسلم بن عوجہ الاسدی

جناب مسلم کو اصحاب حسینؑ میں خاص امتیاز حاصل ہے آپ کا پورا نام مسلم بن عوجہ ابن سعد ابن شعبہ ابن دودان ابن اسد ابن خزیمہ اسدی تھا۔
ابن عوجہ اپنے قبلیہ کے سردار اور اشرف عرب میں تھے۔ عبادت اور زہد میں مشہور تھے لیکن وہ ایسے عابد نہ تھے جو گوشہ عبادت میں ذمہ دار یوں سے اپنا دامن کھینچے ہوئے رہتے ہیں بلکہ وہ ایسے عبادت گزار تھے جنہوں نے اپنے خون سے وضو کر کے بہادری کا مظاہرہ فرمایا۔ مولف ”ابصار العین“ یہ مانتے ہیں کہ مسلم ابن عوجہ نے پیغمبرؐ کی صحبت سے بھی کسب فیض کیا تھا، اور آپ صحابی تھے۔ مسلم ابن عوجہ مرد میدان بھی تھے۔ آپ نے ۲۰۷ھ میں جب مسلمانوں نے خدیجہ ابی یمان کی سرکردگی میں آذربائیجان (ایران) کو فتح کیا تو مسلم بھی اس معركہ میں موجود تھے اور آپ نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

جس وقت مسلم ابن عقیل حسینؑ کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ پہنچنے تو مسلم ابن عوجہ ان کے بہت ہی قریبی مددگار تھے جب ابن زیاد کو فہر پر مسلط ہو گیا اور مسلم بن عقیل نے ہانی کے گھر سے خفیہ مقابلہ کا آغاز کیا اور مجاہدین کو جمع کرنے لگے تو مسلم ابن عوجہ نے مسلم ابن عقیل کے نمائندہ کے بطور لوگوں سے بیعت لی، لیکن تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد مسلم ابن عوجہ کہاں تھے اور حسینؑ کی خدمت میں کیسے پہنچ۔ اس بات کا احتمال ہے کہ جب کوفہ میں یہ خبر پہنچی کہ امام حسینؑ سر زمین عراق پر پہنچ گئے ہیں تو جناب مسلم بن عوجہ نے اپنے کو خدمت امام حسینؑ میں پہنچا دیا ہوا اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی امامؑ کو تھا نہیں چھوڑا۔ شب عاشور جب امام نے اپنے اصحاب کی گردان سے بیعت اتاری اور اجازت دے دی کہ جس کا جی چاہے وہ اپس چلا جائے تو مسلم ابن عوجہ نے تمام اصحاب کی نمائندگی میں اعلان فرمایا: یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے امام کو خطرات میں گھرا چھوڑ کرو اپس پلٹ جائیں۔

ابن عوجہ زمین پر گر کر آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔ امام مسلم کے سرہانے تشریف لائے اور اس بوڑھے مجاہد کے لئے آپ نے دعا کی اور آیتیہ {منہم من قضی نحبہ و منہم من ینتظرو ما بدلو تبیدلایا} کی تلاوت فرمائی۔

اس کے بعد مسلم کے پرانے دوست جناب حبیب ابن مظاہر آگے بڑھے اور انہوں نے مسلم کو مبارک باد پیش کی۔ مسلم نے مسکرا کر ان کی مبارکباد کا جواب دیا۔ حبیب نے مسلم سے وصیت کرنے کی خواہش کی۔ مسلم نے اشاروں سے کہا: ”بس میری وصیت یہ ہے کہ اپنی جان کو حسینؑ برفندا کر دینا حبیب مولا کی نصرت و مدد میں کوتا ہی نہ ہو۔“

لشکر یزید کو جو حسین سپاہیوں کی زبردست جنگ کی وجہ سے بھاگ گیا تھا نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوا۔ لیکن جب مسلم کی کنیز نے ”امیرے آقا“ کی آواز بلند کی تو متوجہ ہو گیا کہ مسلم ابن عوجہ شہید ہو گئے۔ یزیدی لشکر میں خوشی کے شادیاں بننے لگے اس منظر کو دیکھ کر لشکر یزید کا ایک سپاہی شیث ابن رلبی بچھر گیا۔ اس نے کہا: ”کتنی بری بات ہے کہ تم عرب کے ایک بہادر کی موت پر خوشی منار ہے۔ خدا کی قسم میں نے ابن عوجہ کی بہادری کو آذربائیجان کی جنگ میں اپنی آنکھوں

صحیح عاشورا جب شمر نے امام علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی تو مسلم ابن عوجہ ہی تھے جنہوں نے اس کا دندان شکن جواہ دیا۔

جنگ شروع ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ جناب مسلم پیچھے رہ جاتے۔ اگرچہ سن کے اعتبار سے مسلم بوڑھے لیکن جرأت و شجاعت کے اعتبار سے جوان تھے۔ بالآخر شہادت میں سب پر سبقت لے گئے۔ اصحاب امام میں درجہ شہادت پر فائز ہونے والے سب سے پہلے شخص آپ

اس کے بعد انفارادی جنگ میں عبد اللہ ابن عمیر، حرب ابن یزید ریاحی، نافع بن ہلال جملی میدان میں تشریف لائے۔ نافع نے اس طرح رجز خوانی شروع کی ”میں قبیلہ بنی جمل کا چشم و چراغ ہوں۔ میں پیر و علیٰ ہوں“ اس کے بعد آپ نے مبارز طلبی کی تو یزیدی لشکر سے م Zahm ابن حریث آپ سے مقابلہ کے لئے نکلا یہ نافع نے اسے قتل کر دیا۔

پے در پے شکست نے لشکر یزید کے سرداروں کو چوکنا کر دیا۔ عمر و بن جحاج نے جواس سے پہلے بھی اجتماعی حملہ کے لئے حکم دے چکا تھا، اپنے لشکر سے مخاطب ہو کر کہا: ”اب کوئی بھی انفرادی جنگ کے لئے نہ نکلے۔ جو تمہارے مقابل میں جنگ کر رہے ہیں وہ عرب کے چنے ہوئے مردمیوں ان ہیں۔ ان سے کوئی بھی تھام مقابله نہیں کر سکتا، لیکن اگر اجتماعی حملہ کر دیا جائے تو جلد ہی ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔“ عمر سعد نے بھی اس کی موافقت کی اور ان کو دوبارہ لکارتے ہوئے کہا ”آگاہ ہو جاؤ، اے اہل کوفہ! اپنے رہبر (یزید) کی اطاعت میں کوتا ہی نہ کرو۔ جس نے تمہارے رہبر کے خلاف بغاوت کی ہے جو دین سے پھر گیا ہے۔ اس سے جنگ کرو،“ جب امام نے عمر و کی

اور قبیلہ نہ را بن قاسط سے ہیں، عبد اللہ کے ساتھ موجود تھیں۔ مورخین اور سیرت نگار متفق ہیں کہ عبد اللہ بڑے شجاع اور بہادر تھے۔ شیخ طویٰ نے ”الرجال“ میں ان کو اصحاب امیر المؤمنینؑ میں شمار کیا ہے۔

شہر سے دور ہونے کی وجہ سے عبداللہ کو سیاسی حالات کی خبر نہ تھی لیکن جناب مسلم کی شہادت کے بعد جب این زیاد نے لشکر کو جمع کرنا شروع کیا تو اس نگرانی کو اپنے فوج کے لئے پڑا اور قرار دیا تا کہ مکمل تیاری کے بعد وہیں سے لشکر کو کربلا بھیج دے۔ جب یہ ہنگامی صورت حال عبداللہ بن عمیر کو اپنے علاقے میں نظر آئی تو آپ متوجہ ہوئے اور آپ نے حالات کو دریافت فرمایا۔

جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ شکر حسین سے جنگ کے لئے جمع کیا گیا ہے تو آپ بہت پریشان ہوئے ایک بار جذبہ ایمان سینہ میں موجز ہوا آپ نے اپنے دل میں کہا ”تم کو مشکروں سے جہاد کی تمنا تھی۔ اب اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ جوف زند رسول کے دشمنوں سے جہاد کرے گا وہ سرخ رو ہو گا۔“

یہ ارادہ اپنے دل میں کرنے کے بعد آپ اپنی زوج کے پاس تشریف لائے تاکہ ان کو بھی حالات سے آگاہ کر دیں۔ وہب کی زوجہ نے جو ایک شیر دل اور مومنہ خاتون تھیں، اپنے شوہر کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا ”مجھ کو بھی آپ اپنے ہمراہ امام کی خدمت میں لے چلیں۔“ پھر رات کو دونوں نکل یڑے اور امام کی خدمت میں پہنچ گئے۔

صبح عاشور جب امام کے خیموں کی طرف تیر چلا اور اعلان جنگ ہو گیا، تو ابن زیاد کے فلام یہار سالم میدان میں آ کر مبارز طلبی کرنے لگے تو حبیب ابن مظاہر اور بریر ابن خضر غصہ میں آ گئے۔ انہوں نے چاہا کہ ان دونوں یزیدیوں کا کام تمام کر دیا جائے۔ لیکن امام نے ان کو میدان میں جانے سے روکا۔ اس وقت عبد اللہ ابن عمیر نے جو امام کی محبت سے سرشار، شہادت کے لئے تیار تھے، اس موقع کو غنیمت سمجھا اور امام سے جنگ کی اجازت طلب کی۔ امام نے اس جوان کی طرف ایک نظر ڈالی اور فرمایا ”بہادر معلوم ہوتے ہو“۔ پھر آپ نے اجازت دے دی۔ اس طرح

سے دیکھا ہے۔ ابھی مسلمانوں کی طرف سے حملہ نہیں شروع ہوا تھا کہ مسلم نے دشمن کے چھ افراد کو خاک و خون میں غلطان کر دیا تھا۔“

ابن عوسمجہ۔۔۔۔۔ زاہد نبرد آزمائیں۔۔۔۔۔ پیر جواں ہمت

معز کہ کر بلا میں بہت سے زاہدوں نے شرکت کی جو اسلامی معاشرہ میں زہد و تقویٰ،
ورع و پر ہیزگاری اور شب زنده داری میں مشہور روزانہ تھے۔ اب ن عو سچہ بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔

لیکن یہ وہ عابد وزاہد ہیں جنہوں نے ”زہد و عبادت“ کو ذمہ دار یوں اور معاشرہ سے فرار کا بہانہ نہیں بنایا بلکہ انہوں نے مسجد کو مجاز بنایا اور اپنے زہد و عبادت سے باطل کو کچلنے میں توانائی حاصل کرتے تھے۔ اسلام میں گوشہ نشین زاہدوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہاں جوزا ہدشب زندہ دار ہوتا ہے وہی مردمیں ان بھی ہوتا ہے۔ عمر، سن، ضعیفی، کسمی یا پیری جہاد سے فرار کا بہانہ نہیں ہوتی۔

اگر اسلام کی مصلحتیں جنگ میں ضمیر ہوں تو وہ ششیر بکف میدان جنگ میں کوڈ پڑتے ہیں۔ مسلم این عوچہ ہی کو دیکھ لیں آپ کتنے ضعیف تھے، داڑھی اور سر کے بال سفید، بھنویں سفید لیکن اس

کے باوجود آپ نے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ ایسے موقع پر پیر و جوان سبھی حق کی حمایت میں باطل سے لڑنے کو تیار نظر آتے ہیں وہ چاہے ابن عوسمہ ہوں یا قاسم ولی اکبر یا علی اصغر ہوں، ایسے موقع پر سب ہی اسلام کے دفاع کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہاں سن و سال نہیں دیکھا جاتا بلکہ خدا کی راہ میں ذمہ دار یا پیش نظر ہوتی ہیں۔

٢ عبد الله بن عمير كمبى

اصحاب سپر اشیداء میں آپ یہ شخص ہیں جنہوں نے میدان میں آ کر مبارز طلبی کی۔

آپ کا پورا نام ابو وہب عبد اللہ ابن عمیر ابن عباس ا بن عبد قیس ا بن علیم ا بن خباب کلبی علیہم السلام ہے۔ آپ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ آپ اس جگہ رہتے تھے جو شہر سے دور اور نخلیلہ کے نخلستانوں کے نزدیک واقع تھا۔ عبد اللہ کی شریک حیات جو ام وہب بنت عبد کے نام سے مشہور ہیں

دونوں کو اپنی عنایات سے نوازے۔ اے باوفا خاتون! نحیمہ میں پلٹ جا، تو اسے جہاد عورتوں سے ساقط ہے۔“ ام وہب امامؑ کی اطاعت میں نحیمہ میں پلٹ آئیں اور عبد اللہ بھی نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نحیمہ میں واپس آئے۔

اس کے بعد اجتماعی جنگ شروع ہو گئی۔ عبد اللہ اس معرکہ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔ حملہ میمنہ کے ٹوٹ جانے کے بعد جس میں مسلم بن عوجہ شہید ہوئے تھے، دوسرا حملہ میسرہ کی طرف سے شریابن ذی الجوش کی سرکردگی میں ہوا۔ اصحاب حسینؑ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کے حملہ کا زور توڑنے میں عبد اللہ ابن عیمر نے بھی بڑی جانبازی کا ثبوت دیا۔ دشمنوں کے سپاہیوں کو وصل جہنم کیا لیکن آخر اس حملہ میں ہانی بن شیبیت حضری اور بکیر بن حی تیبی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ طبری نے صراحت سے لکھا ہے ”کان القتيل الثاني من اصحاب الحسين“ عبد اللہ (مسلم ابن عوجہ کے بعد) اصحاب حسینؑ میں دوسرے شہید تھے۔

زوجہ عبداللہ نے جب دیکھا کہ عبداللہ تنہا سفر شہادت پر روانہ ہو گئے اور ان کو تنہا چھوڑ گئے تو میتاب ہو کر اپنے شوہر کے جنازہ کے پاس تشریف لا سکیں وہ مومنہ کہہ رہی تھیں: ”اے عبداللہ تم کو بہشت مبارک ہو،“ لیکن شمر نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس شیر دل خاتون کو بھی قتل کر دے۔ اس طرح اس مومنہ کی دلی قسمتاپوری ہوئی۔

٣ عمر و بن خالد

آپ اشراف کوفہ اور دوستدار ان اہل بیتؑ اور مسلم کے ساتھیوں میں سے تھے۔ عمر و اپنے غلام اور تین دوستوں کے ساتھ کربلا میں امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روز عاشوراء آغاز جنگ کے بعد عمرو نے ایئے تینوں ساتھیوں کے ساتھ شکریزید یارِ حملہ کیا اور اسی حملہ میں شہید ہو گئے۔

٣ سعد غلام عمر وابن خالد

عام طور پر آپ کا نام سعد نقل ہوا ہے۔ مگر زیارت شہداء میں سعید کے عنوان سے آپ کا

عبداللہ یہ شخص تھے جو میدان میں تشریف لائے اور آپ نے چہاد کی طرف سبقت کی۔

جب عبد اللہ میدان میں تشریف لائے اور رجز خوانی میں اپنی دلیری کو بیان فرمایا تو یزیدی کہنے لگے: ”هم تو تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابل میں حبیب ابن مظاہر، زہیر ابن قین و یا بریر ابن خضیر آئیں۔“ عبد اللہ غضباناک ہو گئے اور آپ نے حملہ کر دیا، پہلے حملہ میں سیار کو واصل جہنم کی۔ لیکن سالم نے اس مجاہد پر پیچھے سے حملہ کر کے مجروح کیا اور ان کی انگلیوں کو کاٹ دیا۔ لیکن جلد ہی عبد اللہ نے بھی اس کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد عبد اللہ لشکر یزید پرلوٹ پڑے اور انہوں نے رجز خوانی کرتے ہوئے اپنے زوج کو مخاطب کر کے فرمایا ”انی ذعیم لک ام وہب۔۔۔۔۔“ اے ام وہب تم مطمئن ہو میں اس جنگ میں کامیاب رہوں گا۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسی جنگ کروں گا جو ایک بہادر جوان کے ثاثیان شان ہے۔ اس باوفا مونہ اور شیر دل خاتون نے آواز دی ”فدا ک ابی و امی قاتل دون طبیین ذریۃ محمد“ ”اے عبد اللہ میرے ماں باپ تم پرفدا ہو جائیں دودمان پیغمبر گی نصرت میں کوتا ہی نہ ہونے پائے۔“ اور ہتھیار لے کر یزیدی لشکر پر حملہ آور ہوئیں ممکن ہے عبد اللہ کا اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے رجز یہ اشعار پڑھنا شجاعان عرب کی دیرینہ روایات کے مطابق ہو جو میدان جنگ میں اپنی زوجہ یا محبوبہ کو اپنی بہادری کے کارنا موں پر گواہ بناتے تھے۔ لیکن ام وہب یہ شیر دل خاتون تھیں جن کے دل میں اسلام اور ان کے شوہر کی محبت تھی۔۔۔۔۔ عبد اللہ کے رجز یہ اشعار ایک طرف تو ان کی بہادری اور شجاعت کے گواہ ہیں اور دوسری طرف اس بات کے مظہر ہیں کہ زیر سایہ شمشیر بھی انہوں نے اپنی زوجہ کو فراموش نہیں کیا۔ ان کے اشعار نے ام وہب کو بے تاب کر دیا اور وہ میدان میں نکل آئیں، عبد اللہ ام وہب کے پاس آئے اور آپ نے ام وہب کو خیمه میں واپس جانے کے لئے کہا لیکن ام وہب نے جو شہادت کے جذبہ سے سرشار تھیں فرمایا: ”خدا کی قسم میں تم کو تھا نہیں چھوڑوں گی، یہاں تک کہ رہا اسلام میں ندا ہو جاؤں۔“ امام نے جب یہ منظر دیکھا تو آواز دی: ”خدماتم

نام آیا ہے۔ صاحب ”ناخ التواریخ“ نے بھی ان کا نام سعد لکھا ہے۔ یہ عمر کے ساتھ شہید ہوئے۔

۵ مجمع ابن عبد اللہ

آپ اصحاب امیر المؤمنین میں سے تھے۔ عمر ابن خالد کے ساتھ خدمت امام میں پہنچ اور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۶ عائند (عائند) بن مجمع

مجمع بن عبد اللہ کے فرزند تھے اور اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے۔

۷ جنادہ ابن حارث سلمانی

اہل کوفہ میں سے تھے۔ شیخ طویل نے ”الرجال“ میں آپ کو اصحاب امام حسین میں شمار کیا ہے لیکن سماوی نے ”ابصار العین“ میں لکھا ہے کہ جنادہ حضرت علیؑ کے ساتھ صفين میں شریک ہوئے اور کوفہ کے مشاہیر شیعہ میں سے تھے۔

۸ جندب ابن حجیر کندی خولا نی

کوفہ کے رہنے والے اور مشہور شیعوں میں تھے۔ جنگ صفين میں امیر المؤمنین کے ساتھ شریک ہوئے۔ ”ناخ التواریخ“ اور زیارت شہداء میں آپ کا نام شہداء کے درمیان آیا ہے۔ صاحب ”حدائق الورديه“ نے لکھا ہے کہ جناب جندب کے صاحبزادہ بھی شہید ہوئے، مگر یہ ثابت نہیں ہے۔

ان افراد کی شہادت کے بعد حملہ اولیٰ شروع ہوا جس میں انفرادی اور اجتماعی جنگ ہوئی۔ معتبر تاریخوں کے مطابق اس جنگ میں بچپاس انصار حسینؑ شہید ہو گئے۔

۹ ادہم ابن امیہ عبدی بصری

قبیلہ عبد قیس اور اہل کوفہ میں سے تھے۔

۱۰ امیہ ابن سعد ابن زید طائی

عرب کے مشہور بہادر تھے، ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جنگ صفين میں شرکت کی تھی۔ آٹھویں محرم کو امامؑ کی خدمت میں کربلا پہنچ۔

۱۱ جابر ابن حجاج

عامر ابن نہشل تیمی کے آزاد کردہ غلام اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ عمر سعد کے لشکر کے ساتھ کربلا پہنچ اور مخفی طور پر امام حسینؑ سے آکر مل گئے۔

۱۲ جبلہ بن علی شیبانی

اہل کوفہ میں سے تھے شجاعت میں بہت مشہور تھے۔ آپ نے بھی جنگ صفين میں شرکت کی تھی۔

۱۳ جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزری

کہہی سے امام کے ساتھ تھے۔ زیارت شہداء جو اہن طاووس نے نقل کی ہے۔ اس میں جنادہ کا نام نہیں ہے لیکن ماغانی نے ”تتفق المقال“ میں جوزیارت نقل کی ہے اس میں جنادہ کا بھی نام ہے۔

۱۴ جوبن (جوین) ابن مالک ابن قیس بن ثعلبة تیمی

قبیلہ تیم کے ساتھ رہتے تھے اور کوفہ سے عمر بن سعد کے لشکر کے ساتھ کربلا پہنچ۔ جب آپ نے دیکھا کہ صلح کی کوئی امید نہیں ہے اور جنگ یقینی ہے تو آپ قبیلہ بنی تیم کے کچھ افراد کے ساتھ حسینؑ کی طرف چلے آئے اور پاسداران حق میں شامل ہو گئے۔ مولف ”ناخ التواریخ“ نے آپ کا نام جون ابن مالک بتایا ہے لیکن انہوں نے جون، غلام ابوذر اور جوبن ابن مالک کے نام میں غلطی سے ایک کر دیا۔

۱۵ حارث ابن امراء اقیس ابن عابس کندی

آپ زہد و تقویٰ اور شجاعت و دلیری میں مشہور تھے۔ جنگوں میں شرکت کرچکے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قلعہ ”بجیر“ کا حاصرہ کیا تھا جب مرتدین مارے جانے لگے تو آپ نے اپنے چچا پر حملہ کیا اس نے کہا: ”میں تمہارا چچا ہوں۔“ حارث نے جواب دیا: ”میں جس کے لئے لڑ رہا ہوں وہ میرا خدا ہے۔“ کربلا میں بھی حارث عمر سعد کے لشکر کے ساتھ آئے اور اس کے بعد پھر امامؑ کی طرف آگئے۔

۱۶ حارث بن بنہان (بنہان)

جمزہ بن عبدالمطلب کے غلام کے فرزند تھے۔ حارث نے حضرت علی، امام حسن اور ان کے بعد امام حسینؑ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ مدینے سے امامؑ کے ہمراہ تھے۔

۱۷ حباب ابن حارث

ابن شہرآشوب نے ان کے نام کو حملہ اولیٰ کے شہداء کی فہرست میں درج کیا ہے۔

۱۸ حباب ابن عامر ابن کعب تیمی

یہ اہل کوفہ اور شیعوں میں سے تھے۔

۱۹ جلبشہ بن قیس النجی

جبشہ کے دادا پیغمبر کے صحابی تھے۔ ”البصار لعین“ میں آپ کا نام جبشہ ابن قیس لکھا ہے۔ شاید غلطی سے ایسا ہو گیا ہو۔

۲۰ حجاج ابن زید سعدی تیمی

بصرہ کے رہنے والے تھے۔ جب امام حسینؑ مکہ سے سفر کرنے والے تھے تو آپ نے چندر خطوط رسماء بصرہ کے نام لکھے تھے۔ اس خط کی وجہ سے حجاج امامؑ کی خدمت میں پہنچے۔

۲۱ حلاس بن عمرو ازدی راسی

امیر المؤمنینؑ کے صحابی اور حضرت کی ظاہری خلافت کے زمانے میں حافظین شہر کے افسر اعلیٰ (پویس کے چیف) تھے۔ آپ بھی کربلا میں عمر سعد کے لشکر کے ساتھ آئے اور اس کے بعد امام حسینؑ سے مل گئے۔

۲۲ حظله ابن عمر (عمرو) شیبانی

ابن شہرآشوب نے حملہ اولیٰ کے شہداء میں ان کا نام ذکر کیا ہے۔

۲۳ زاہر بن عمرو اسلمی کندی

صحابی رسول اور راوی احادیث ہیں۔ بیعت رضوان، صلح حدیبیہ اور جنگ خیبر میں موجود تھے۔ ۶۰ھ میں حج کے لئے گئے ہوئے تھے کہ مکہ میں امام حسینؑ سے ملاقات کے بعد امامؑ کے ہمراہ ہو گئے۔

۲۴ زہیر ابن بشرختمی

زیارت شہداء میں ان کا نام درج ہے۔ ابن شہرآشوب نے بھی ان کا نام لکھا ہے۔

۲۵ زہیر ابن سلیم ابن عمرو ازدی

یہ عمر سعد کے ان سپاہیوں میں سے تھے جو امام سے آکر مل گئے۔

۲۶ سالم غلام عامر ابن مسلم العبدی

یہ عامر کے غلام تھے۔ عامر کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے۔

۲۷ سلیم

امام حسینؑ کے باو فاغلام تھے اور کربلا میں آپ نے حسینؑ کے قدموں پر جان دے دی۔

۲۸ سوارابن ابی عمیرہ نبی

شیخ طویّ کے کتاب ”الرجال“ میں ان کو اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے اور شیخ طویّ نے ”من لا حضرة الفقیہ“ میں باب ”میراث الحسنین“ میں ان سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ یہ کہ بلا میں امام کی خدمت میں پہنچے۔

۲۹ سیف ابن مالک عبدی

اہل بصرہ اور شیعہ تھے۔

۳۰ شبیب ابن عبد اللہ

حارث ابن سریع ہمدانی کے غلام اور پیغمبرؐ اور علیؑ کے صحابی تھے، کوفہ میں رہتے تھے۔

۳۱ شبیب (شبیب) ابن عبد اللہ نہششلی

یہ تابعین اور اصحاب علیؑ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مدینہ ہی سے امامؑ کے ہمراہ تھے۔

۳۲ ضرغامہ ابن مالک قلبی

شیخ طویّ نے رجال میں ان کو اصحاب حسینؑ میں شمار کیا ہے۔ یہ بھی کوفہ کے رہنے والے تھے۔

۳۳ عامر ابن مسلم عبدی بصری

آپ بصرہ کے رہنے والے تھے۔

۳۴ عباد ابن مہاجر ابن ابی المهاجر جرجمنی

ان بادیہ نشین (بدو) عربوں میں سے تھے جو راستے میں امامؑ سے آکر مل گئے تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت خطرے کو محسوس کر کے متفرق ہو گئی۔

۳۵ عبد الرحمن ابن عبد رب النصاری خزری

۳۶ عبد الرحمن ابن عبد اللہ بن کدن ارجی
آپ تابیٰ ہیں۔ وہ گروہ جو کوفہ سے امامؑ کو بلانے کے لئے مدینہ آیا تھا، اس میں آپ بھی تھے۔

۳۷ عبد الرحمن ابن مسعود

لشکر عمر سعد میں تھے مگر ساتویں محرم سے ملحق ہو گئے۔

۳۸ عبد اللہ ابن بششمی

اپنے زمانہ کے بڑے مشہور بہادر تھے۔ آپ نے قادریہ کی جنگ میں شرکت کی تھی اور آپ بھی عمر سعد کے شکر میں تھے لیکن پھر امامؑ سے آکر مل گئے۔

۳۹ عبد اللہ ابن یزید ابن شبیط (شبیط) قیسی

بصرہ سے نصرت امام حسینؑ کے لئے تشریف لائے۔

۴۰ عبید اللہ ابن یزید ابن شبیط (شبیط) قیسی

آپ عبد اللہ کے بھائی تھے۔

۴۱ عقبہ ابن صلت جہنی

آپ ان بدوعربوں میں شامل تھے جو راستے میں امامؑ کے ساتھ ہو گئے۔ ماغانی نے آپ کو ان اصحاب رسولؐ میں شمار کرتے ہیں جو مدینہ ہی سے امامؑ کے ساتھ تھے۔

۴۲ عمار ابن ابی سلامہ دالالی (دالالی)

ابن ججر کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صحابی پیغمبرؐ علیؑ تھے۔ آپ نے جمل و صفين و نہروان میں بھی شرکت کی تھی۔ ابن شہر آشوب نے مقتولین حملہ اویں میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

۳۳ عمرا بن حسان طائی

آپ کے والد حسان ابن شریح اصحاب علیؑ میں سے تھے اور جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ زیارت شہداء میں عمار پر بھی سلام بھیجا گیا ہے۔

۳۴ عمر وابن ضبیعہ بن قیس ابن شعبہ یمنی

لشکر ابن سعد کے ساتھ آئے اور پھر امامؐ سے ملحت ہو گئے۔

۳۵ عمران ابن کعب ابن حارث اشجعی

مناقب ابن شہر آشوب میں اور زیارت شہداء میں آپ کا نام موجود ہے۔ صاحب ”ناخ التواریخ“ نے آپ کا نام عمر ابن کعب بتایا ہے۔

۳۶ قارب غلام حسینؑ

آپ کی ماں جناب رباب (مادر جناب سکینہ) کی کنیز تھیں۔ آپ مدینہ ہی سے امام کے ساتھ تھے۔

۳۷ قاسط ابن زہیر ابن حارث تغلبی

امیر المؤمنینؑ کے صحابی تھے اور کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔

۳۸ قاسم ابن حبیب ابن ابی بشرازدی

شیعیان کوفہ میں سے تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کو اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے۔

۳۹ کردوس ابن زہیر ابن حارث تغلبی

یہ قاسط ابن زہیر کے بھائی اور امیر المؤمنینؑ کے صحابی تھے۔

۴۰ کنانہ ابن عقیق تغلبی

حافظ قرآن، عابدو زاہد اور بڑے شجاع تھے۔

۴۱ مجع بن زیاد ابن عمرو جنی

آپ بھی انہیں بدوعرب بوس میں سے تھے جو راستہ میں امام حسینؑ سے آکر مل گئے تھے۔

۴۲ مسعود ابن حجاج یمنی

کوفہ کے رہنے والے اور نمایاں شیعہ تھے۔ عمر سعد کے ساتھ آئے لیکن ساتویں محرم کو امام سے آکر مل گئے۔

۴۳ مسلم بن کثیر اعرج

شیخ طویلؓ نے رجال، میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ انہیں اعرج اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے پیر میں لنگ تھا۔ حضرت علیؑ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر زخمی ہوئے اور کوفہ میں ساکن تھے۔

۴۴ مقططف ابن زہیر ابن حارث تغلبی

آپ بھی اپنے دونوں بھائیوں کی طرح صحابی علیؑ تھے۔ شیخ طویلؓ نے آپ کا تذکرہ فرمایا ہے لیکن زیارت شہداء میں صرف آپ کے دونوں بھائیوں کا ذکر ہے۔

۴۵ منج بن زیاد

مامغافلی نے زیارت ”رجیبیہ“ سے نقل کرتے ہوئے ان کو شہداء عاشوراء میں شمار کیا ہے۔

۴۶ نصر ابن ابی نیزر

کہا جاتا ہے کہ ان کے والد نجاشی بادشاہ کے خاندان سے تھے جو پچھنے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پیغمبرؐ اور علیؑ کی خدمت میں رہے۔ نصر کے والد بھی حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ نصر مدینہ ہی سے امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔

۴۷ نعمان بن عمرو وازدی راہبی

کوفہ کے رہنے والے تھے۔ صفين میں شرکت فرمائی اور اپنے بھائی کی طرح عمر سعد کے ساتھ کر بلاؤئے، اس کے بعد امام میں مل گئے۔

۵۸ نعیم ابن عجلان الاصاری

حضرت علیؑ کے زمانے میں بحرین کے والی نعمان کے فرزند تھے۔ کوفہ سے امام کی خدمت میں پہنچ۔

یہ وہ شہداء تھے جو حملہ اولیٰ میں شہید ہو گئے اور اب ان شہداء کے نام درج کر رہا ہوں جو حملہ اولیٰ کے بعد نماز ظہر تک شہید ہوئے۔

۵۹ بکر بن حبی بن قیم بن تعلیمی

عمر سعد کے لشکر میں تھے اور بعد میں امام میں مل گئے۔

۶۰ عمر ابن جنادہ بن کعب خزری

ان کے والد جنادہ ابن کعب حملہ اولیٰ کے شہداء میں سے ہیں۔ عمر ابن جنادہ کی عمر صرف دس سال کی تھی یہ کس نوجوان امام کی خدمت میں تشریف لا یا تاکہ اذن جہاد طلب فرمائیں۔ امام نے فرمایا: ”تم نوجوان ہو۔ تمہاری موت تمہاری ماں کے لئے بہت سخت ہو گی، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے شہر سے محروم ہو چکی ہیں۔“ عمر نے کہا: ”لیکن اس لباس جنگ کو خود میری ماں نے پہنایا ہے۔“ یزید پیوں نے عمرو کے سر کو کاٹ کر ان کی ماں کی طرف پھینک دیا لیکن اس شیر دل خاتون نے سر کو چوم کر دوبارہ میدان میں ڈال دیا اور کہا: ”ہم جس چیز کو خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں اسے واپس نہیں لیتے!!!“ اس کے بعد خود بھی لشکر یزید پر جھپٹیں مگر امام نے مادر عمر و کو واپس خیمه میں پلٹا دیا۔

۶۱ یزید ابن حسین مشرقی

کوفہ کے رہنے والے تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کو بھی اصحاب حسین میں شمار کیا ہے۔

زیارت شہداء میں ان پر بھی سلام ہے اور صاحب ”ناخ التواریخ“ نے بھی ان کا ذکر شہداء کر بلاؤں کیا ہے۔

۶۲ جبیب ابن مظاہر اسدی

عرب کے مشہور شاعر ربیعہ کے چپازاد بھائی تھے۔ ابن بکری جبیب کو صحابی رسولؐ اور شیخ طویلؐ ان کو صحابی علیؑ و حسنؑ و حسینؑ سمجھتے ہیں۔ جبیب حضرت علیؑ کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت علیؑ کے روز باطنی سے آگاہ تھے۔ جبیب حسینؑ کے پچھنے کے دوستوں میں سے تھے۔ آپ کو حسینؑ کے اصحاب کے درمیان مخصوص بلندی حاصل ہے۔ کوفہ سے جو دعوت نامہ آیا تھا اس میں جبیب کا نام بھی نظر آتا ہے۔ نویں محرم کی رات جبیب نے فوج یزیدی کو نصیحت کی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ صبح عاشوراء امامؑ کی شان میں شمرکی جسارت کا دندان ٹکن جواب دیا۔ روز عاشوراء امامؑ نے جبیب کو اپنے مختصر سے لشکر کے میسرہ کی سرداری عطا کی۔ نماز ظہر کے وقت ابن عقیم نے امامؑ کی شان میں جسارت کی۔ جبیب غضبناک ہو کر حملہ آور ہوئے اور دشمن جبیب پر ٹوٹ پڑے اور اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔

۶۳ حرابن یزید ریاضی

حرابن یزید ابن ناجیہ ابن قصنب (قعنب) ابن عتاب ابن ہرمی ابن ریاح ابن یربوع ابن حنظله ابن مالک ابن یزید ابن لحیم لحیمی۔ عرب کے ایک محترم اور مشہور خانوادہ سے تھے۔ حر کے داد، عتاب بادشاہ حیرہ نعمان ابن منذر کے مشیر اور بہت ہی قربی تھے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ ان کا اتنا احترام کرتا تھا کہ صرف انہیں کا گھوڑا بادشاہ کے گھوڑے کے برابر میں چل سکتا تھا اور بقیہ دوسرے امراء، بادشاہ کے پیچھے چلتے تھے۔ عتاب کے دو فرزند تھے: قیس اور قصنب، عتاب کے مرنے کے بعد قیس باپ کے جانشین ہوئے۔ بنی شیبان ان سے جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ نتیجہ میں مشہور جنگ ”یوم الطحفہ“ واقع ہوئی۔ قیس ہی کے خاندان سے احوال شاعر تھے جو اصحاب پیغمبرؐ

میں شمار کئے جاتے ہیں۔ احوص قیس کے والد کے چچا زاد بھائی تھے۔

خود جناب حرب کا شمار کوفہ کے اشراف اور رہبروں میں تھا۔ فوج ابن زیاد کے ایک بڑے کمانڈر تھے۔ حاشکر قادسیہ میں جو حسین کی سر کردگی میں امام کے محاصرہ کے لئے بھیجا گیا تھا، موجود تھے۔ اس کے بعد کوفہ میں وارد ہونے سے روکنے کے لئے جو ایک ہزار کا لشکر بھیجا گیا تھا۔ حراس کے سردار تھے۔ اس کے نتیجہ میں امام کو کربلا میں اترنا پڑا۔ امام کے ساتھ حرب کا پہلا سلوک ایک دشمن کا سلوک تھا، لیکن لشکر حرب کو جب امام نے پانی سے سیراب کیا تو امام کا یہ انسانی سلوک اور معنوی کشش حرکی روح کی گہرائیوں پر اثر انداز ہوئی۔ جب حرب کا لشکر امام کے قافلہ سے ملا تو پورا لشکر جاں بلب تھا۔ امام نے وہ سارا پانی جو آپ کے پاس تھا، دشمن کو پلا دیا۔ اس سلوک نے حرب کے اوپر شدید نفیسیاتی اثر ڈالا۔ لیکن روز عاشورا تک حرب یزید کے لشکر میں تھے۔ صبح عاشوراء آپ نے اپنا راستہ منتخب کر لیا اور امام کی طرف چلے آئے۔

جنگ شروع ہونے کے بعد جب یزیدی لشکر کے دوسرا ہی عبد اللہ ابن عمیر کے ہاتھوں مارے گئے تو عمر وابن ججاج جوابن زیاد کے مینڈ کے لشکر میں تھا بہت پریشان ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اجتماعی طور پر حسینؑ کی فوج پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن حسینؑ کے اصحاب نے بڑی بہادری سے جنگ کی اور دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ دشمن کا بڑا نقصان ہوا۔ حرب جو اس تمنا میں تھے کہ سب سے پہلے اپنی جان راہ اسلام میں قربان کر دیں، جب اس منظر کو دیکھا تو اور بھی ہوشیار ہو گئے کہ کہیں انصار حسینؑ میں سے کوئی دوسرا سبقت نہ لے جائے۔ آپ امام کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کی: ”اے میرے آقا! میں پہلا شخص تھا جو آپ کے مقابل آیا اور اب میری تمنا یہ ہے کہ سب سے پہلے میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔“ امام نے حرب کو اجازت دے دی۔ حرب دیرانہ شعر پڑھتے ہوئے تشریف لائے: ”میں حرب ہوں۔ کافروں پر اپنی تلوار سے ایسا وار کروں گا جو تاریخ میں بھلانے کے مقابل نہ ہو۔ سرز میں مکہ کے بزرگ ترین انسان کی رہبری میں، میں دشمنوں کو تفعیل کروں گا۔“ پھر اس کے بعد آپ نے حملہ کر دیا۔

صبح عاشوراء جب یہ بات لشکر یزید میں پھیل گئی کہ حرامؓ کے لشکر سے جا کر مل گئے تو ایک کوفی سپاہی جس کا نام یزید ابن سفیان تھی تھا، کہتا ہے:

”خدا کی قسم اگر میں اس وقت متوجہ ہو گیا ہوتا تو نیزہ کے ایک ہی وار سے حرب کا کام تمام کر دیتا۔“ اب حرت نہایت یزید کے لشکر سے لڑنے جا رہے تھے، تلواروں کے وار کر رہے تھے اور آگے بڑھتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے: ”ماذلت ارمیهم ثبغره نحره و لبانه حتی تسریل بالدم“ ”میں گھوڑے کی گردن اور سینہ کو دشمن کی فوج میں ڈال دوں گا یہاں تک کہ میرا رہوار خون کی چادر اوڑھ لے۔“ یہ شعر کامل طور پر ان کے حالات کی تصویر کشی کر رہا ہے اس لئے کہ حرب کا گھوڑا شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس وقت حسین ابن تمیم نے جو سپاہ قادریہ کا سردار تھا جس میں پہلے حرب بھی رہ چکے تھے، یزید ابن سفیان سے کہا: ”تجھے یہ تمنا تھی کہ حرب کو قتل کرے گا۔ اب آگے کیوں نہیں بڑھتا۔“ یزید ابن سفیان کے دل میں شیطانی خیال آیا اور حرب کے مقابل آکر مبارز طلبی کرنے لگا لیکن حرب نے اتنی جلدی اس کا کام تمام کیا کہ طبری کے مطابق جو خود حسین سے نقل کرتا ہے، حسین نے کہا: ایسا لگا کہ یزید کی جان حرب کی ہٹھی پر تھی۔ اس واقعہ کے بعد ابن زیاد کے سپاہیوں میں سے کسی نے تھا حرب سے مقابلہ کرنے کی ہست نہیں کی۔ حرب بھی جن کا گھوڑا شدید زخمی ہو گیا تھا امام کے لشکر میں واپس آگئے۔ اس کے بعد اس ”جنگ مغلوبہ“ میں شرکت کی۔ پہلے ہی حملہ میں حرب کا رہوار گر پڑا۔ اور حرب پیاہدہ ہو گئے جبیب ابن مظاہر کی شہادت جس نے امام کو بہت متاثر کیا تھا اس کے بعد حرب نے ارادہ کیا کہ منزل شہادت تک پہنچنے میں دیر نہیں کروں گا۔ امامؓ سے اجازت مانگی اور میدان جنگ میں آکر زبان پر کچھ اشعار جاری کئے جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”خدا کی قسم جب تک دشمنوں کو وصل جہنم نہ کروں گا قتل نہیں ہوں گا۔ میں صرف اسی حال میں زمین پر گروں گا جب آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ آج ایسی شمشیر زندگی کروں گا جو تاریخ میں یادگار بن جائے۔ نہ میں فرار کروں گا۔“

اور نہ کوتا ہی سے کام لوں گا۔“

کبھی فرماتے تھے:

”میں ان کی محبت میں توار چلا رہا ہوں جنہوں نے

سرز میں حرم کو آبروجخشی“

معلوم نہیں کہ امام کے حکم سے یا اپنے صواب دیدیکی بن پر زہیر قین بھی حر کے ساتھ مشغول جنگ تھے۔ ان دونوں مجاہدوں میں سے جب کوئی ایک مجاہد گھر جاتا تھا تو دوسرا مجاہد اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتا تھا۔ بڑی دیر تک یہی صورت حال رہی۔ اس کے بعد شمن کے لشکرنے ہر جانب سے حر پر حملہ کر دیا اور جناب زہیران کی مدنہ کر سکے۔ آخر میں ایوب ابن مسرح کے ہاتھوں اس بزرگ اور دلیر سردار کی شہادت ہوئی۔

جب حر کے خون آلود جسم کو امام کے پاس لاایا گیا تو آپ نے اپنے سپاہی کی اس طرح عزت و جلالت دی کہ حر کے پہلو میں بیٹھ گئے، خاک و خون کو ان کے جسم سے صاف کیا اور فرمایا ”میں گواہی دیتا ہوں تم دنیا و آخرت دونوں میں حر (آزاد) ہو۔“

اماں کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی آزادی اس کے رفتار عمل سے جھلکتی رہے۔ وہ شخص جو ہوا نے کس کے جال میں گرفتار ہو، کسی بھی صورت میں آزاد نہیں ہے۔

حر کا ولیرانہ انتخاب

حر کی زندگی کے بارے میں جو گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء میں حر ظلمت کے گھرائیوں اور تباہی کے بھنوں میں بھنسے ہوئے انسان تھے۔ اس کے بعد نورانی ذرہ کی طرح آفتاب کی طرف پرواز کیا۔ حر مامور ظلم تھے اور جنگ حق و باطل کے درمیان کشکاش میں تھے، بلکہ باطل کی طرف تھے۔ آپ نے آخری گھریوں اور آخری فرصت میں انتخاب کیا۔ ایک بڑا انتخاب، ایسا انتخاب جو انسانی وجود کی سب سے اعلیٰ تجھی ہے۔ ظلمت کا سینہ چاک

کر کے نور کی سمت پرواز کر گئے۔ یہ انتخاب کوئی معمولی انتخاب نہ تھا بلکہ حق و باطل اور کفر و ایمان کے درمیان انتخاب تھا، وہ بھی جان کی قیمت پر۔ حر نے جو انتخاب فرمایا وہ یقیناً تاریخ کا بہت بڑا انتخاب ہے اور یہ سچ ہے کہ حر اسم بامگی تھے۔ انہوں نے اپنے آزاد ہونے کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا اور تاریخ انسانیت میں غلامی، سیاست اور نفسانیت کی زنجیروں سے آزادی کا نمونہ بن گئے۔ اسی وجہ سے شہادت کے بعد جب امام حر کے سرہانے پہنچے تو آپ نے حر کے حر ہونے کو سراہتے ہوئے فرمایا: ”اے حر تجھے مبارک ہو تیری ماں نے تیرا نام حر رکھا تو دنیا میں بھی حر ہے اور آخرت میں بھی حر ہے۔“

حر نے جب سے امام کو دیکھا تھا ان کی روحانی جذب و کشش سے متاثر تھے ان کی حقانیت کا یقین کر چکے تھے لیکن شروع میں انتخاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ صلح و صفائی سے کام چل جائے۔ اپنے کام کی حفاظت بھی ہو جائے اور حر ہونے کی لاج بھی رہ جائے یعنی انسانی وجود کی اصلیت کی لاج۔ لیکن حالات نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور حر کا اضطراب بڑھا اور اب وہ وقت آگیا تھا کہ اپنے وجود حریت اور جاہ و منصب میں سے کسی ایک کا انتخاب لازمی تھا۔

عمر سعد سے حر کی گفتگو نفس کی اس اندر ورنی کشکش کا نمونہ ہے۔ یہ گفتگو حر کے اضطراب اور درد و کرب کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے۔ کربلا کی جنگ شروع ہونے سے پہلے حر کے نفس میں ایک کربلا پاپتھی۔ جب نفس ایک طرف چاہتا تھا کہ غلامی کی زنجیروں میں بکڑا رہنے دے، دوسرا طرف نام کا تقاضا یہ تھا کہ ان زنجیروں کو توڑ کر اپنے اصلی وجود کو حاصل کر لیا جائے۔ حریت کا وہ وجود جو ابھی تک صرف نام کی حدود میں تھا، اسے حقیقت کی شکل دینا چاہتے تھے۔

جانب حر عمر سعد سے پوچھتے ہیں: ”کیا اس قضیہ کو صلح کے ذریعہ تتم نہیں کر سکتے۔“ عمر سعد جواب دیتا ہے: ”اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا لیکن تیرا امیر عبید اللہ ابن زیاد جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔“ حر نے درد و کرب و اضطراب سے بھرے اجھے میں پوچھا: ”تو اس کا مطلب

یہ ہے کہ تم حسینؑ سے جنگ کرو گے؟“ عمر سعد نے جواب دیا: ”بحدالیکی جنگ کروں گا کہ سر اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔“

حرنے اپنی زندگی کا سب سے آخری انتخاب کیا۔ اب حر میں نگ و عار کی تاب نہ تھی۔ وہ ابن سعد حسیوں کے مانند نہ تھے جونگ و عار کو جھیلتے رہتے ہیں وہ تو دوسرے میدان کے شہ سوار تھے، وہ حر (آزاد) تھے۔ حر نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے وجود کو پالیا اور ایک ہی جست میں ظلمت سے نور کی طرف آگئے۔ چند ہوں میں انہوں نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا، شیطان سے خدا تک کافاصلہ!! اور اب جناب حر آزاد تھے۔ آفریں صد آفریں کہ آپ دنیا میں بھی آزاد تھے اور آخرت میں آزاد ہو گئے۔

۶۲ سعید ابن عبد اللہ الحنفی

کوفہ کے محترم شیعوں میں سے تھے اور عبادت و شجاعت میں مشہور زمانہ تھے۔ شیعیان کوفہ کے نمائندہ کی حیثیت سے امام کو بلانے کے لئے مدینہ تشریف لے گئے۔ کوفہ میں مسلم کے مددگار تھے۔ جب وقت ظہر امام نماز کے لئے ہٹرے ہوئے تو سعید امام کے آگے ہٹرے ہو گئے تاکہ دشمنوں کے آنے والے تیروں کے لئے سپر بن جائیں اور پھر شہید ہو گئے۔

۶۳ زہیر ابن قین ابن قیس الجبلی

شرانے عرب اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے زمانہ میں زہیر عثمانی تھے اور شیعوں سے ان کا رابطہ تھا۔ لیکن ۶۰ھ میں جب حج کے مقصد سے مکہ گئے تو ان میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ صبح عاشورا امامؑ نے آپ کو مینہ لشکر کا سردار بنادیا۔ عاشور کے دن زہیر نے اپنی شہادت سے بہادری کے وہ انمٹ نشان چھوڑے جسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ نماز ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

۶۴ سلمان بن مضراب بن قیس الجبلی

زہیر کے بچا زاد بھائی تھے اور آپ بھی زمانہ حجؑ سے امامؑ کے ساتھ ہو گئے تھے۔

۶۵ عمر وابن قرظہ بن کعب الانصاری

آپ کے والد قرظہ صحابی پیغمبر تھے۔ صاحب ”ناخ التواریخ“ نے ان کا نام عمر وابن قرظہ لکھا ہے جو بہت بڑی غلطی ہے۔

۶۶ نافع بن ہلال جملی

نافع نے عاشور کے دن بڑی بہادری کا مظاہرہ فرمایا۔ آپ بڑے ماہر شہیر زن تھے۔ یزید یوسف کے بارہ افراد کو قتل کیا۔ اس کے بعد آپ شر کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

۶۷ بریر ابن خفیرہ مدانی

عبد وزاہد اور حافظ قرآن تھے۔ حضرت علیؑ کے صحابی کوفہ کے رہنے والے اور ہمدانی قبیلہ کے شرافاء میں سے تھے۔

۶۸ ابوثمامہ صائدی

شیخ طوسیؑ نے ”رجال“ میں ابوثمامہ کو اصحاب حسینؑ میں شمار کیا ہے۔ آپ بزرگ شیعوں میں سے اور بڑے مشہور بہادر تھے۔ کوفہ میں جناب مسلم ابن عقیل کے مددگار تھے۔

۶۹ جون غلام ابوذر غفاری

جون کارنگ سیاہ تھا آپ افریقی تھے اور فضل ابن عباس ابن عبدالمطلب کے غلام تھے۔ حضرت علیؑ نے آپ کو خرید کر ابوذر کو پھر کر دیا تھا۔ رہنڈہ میں جناب ابوذر کے ساتھ تھے۔ ابوذر کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ کی خدمت میں پھر امام حسنؑ کی خدمت میں اور اس کے بعد سید الشہداءؑ کے ساتھ رہے۔ مختلف کتابوں میں شہدائے عاشوراء کے کچھ اور نام بھی موجود ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

- ۷۲ شوذب ابن عبد اللہ
۷۳ عابس ابن ابی شبیب شاکری
۷۴ عبد اللہ ابن عروہ ابن حراق غفاری
۷۵ عبدالرحمن ابن عروہ غفاری
۷۶ حنظله ابن اسعد شبامی
۷۷ سیف ابن حارث ابن سریع ابن جابر ہمدانی
۷۸ مالک ابن عید (عبد/عبد اللہ) ابن سریع
۷۹ غلام ترکی
۸۰ حجاج ابن مسروق جعفری
۸۱ زیاد ابن عربی ہمدانی
۸۲ سالم ابن عمر وابن عبد اللہ غلام بن (بنی) المدینہ الکبیری
۸۳ سعد ابن حارث غلام امیر المؤمنین
۸۴ عمر ابن جندب حضرمی (حضرمی)
۸۵ قعنسب (قعنسب) ابن عمرو نمری
۸۶ یزید ابن شبیط عبدی
۸۷ یزید ابن زیاد ابن مہا صرا ب ابو الشعثاء کندی

- ۸۸ یزید ابن مغفل جعفری کوفی
۸۹ رافع ابن عبد اللہ غلام مسلم ازدی
۹۰ بشر ابن عمر وابن الاحدوث الحضرمی الکندی
۹۱ سویدا ابن عمر وابن ابی المطاع خشمی (خشمی)

دوسرے میں اصحاب کے نام مختلف کتابوں میں جیسے ”العباد لعین“، ”مناقب ابن شهر آشوب“، ”ناسخ التواریخ“، ”اصابة“، وغیرہ میں ذکر ہوئے ہیں۔ (اس سلسلہ میں سید العلما مولانا علی نقی نقوی صاحب کی کتاب شہداء کر بلا ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔)

شہداء بنی ہاشم
اصحاب کی شہادت کے بعد بنی ہاشم، دودمان امامت اور وابستگان امامؑ کی باری آئی۔ پیغمبر اکرمؐ جنگوں میں اپنے اعزہ واقارب کو دوسروں پر مقدم فرماتے تھے۔ اسی وجہ سے بنی ہاشم کے افراد جیسے حزہ وجعفر ان جنگوں میں شہید ہوئے لیکن کربلا میں امامؑ نے پہلے اصحاب کو میدان جنگ میں بھیجا۔ اس کے بعد اعزہ کی باری آئی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ان جنگوں میں کچھ شہید ہوتے تھے، کچھ زندہ رہ جاتے تھے، لیکن عاشور کے دن صحراۓ کربلا میں تمیں ہزار کے لشکر کے مقابل میں تھوڑے سے افراد تھے اور یہ معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی بھی حتیٰ کہ طفل شیرخوار بھی زندہ نہیں بچے گا۔ چونکہ یہاں تین دن پہلے پانی بھی ختم ہو گیا تھا، اس لئے جو شخص پہلے شہید ہو جاتا اس کو کم اذیت پہنچتی اور جو زیادہ دیر تک زندہ رہ جاتا ہے اس کو زیادہ تکلیف ہوتی۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ حسینؑ علی اکبر سے کہتے کہ ”تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم بہشت میں جا کر سیراب ہو جاؤ اور غلام ابوذر پیاسارہ جائے۔“ اس لئے جب تمام اصحاب شہید ہو چکے، تب بنی ہاشم کی باری آئی۔ چونکہ شہداء بنی ہاشم کے حالات بہت مشہور ہیں اس لئے ہم یہاں صرف ان شہداء کی

فہرست پیش کر رہے ہیں:
بنی ہاشم کا پہلا شہید

کہا جاتا ہے کہ فرزندان مسلم خاندان بنی ہاشم کے سب سے پہلے شہید ہیں۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے شہید جناب علی اکبر ہیں۔ ”کان اول قتیل من بنی ابی طالب یومنذ علی الاکبر بن الحسین“ صاحب ”العباد العین“ تحریر فرماتے ہیں: ”قال ابو الفرج وغره و كان اول من قتل بالطف من بنی هاشم بعد انصار الحسين على ابن الحسين“ شیخ ابن ادریس حلی نے ”سرائر“ میں لکھا ہے: ”هواول قتیل فی الواقعة من آل ابی طالب“ وہ آل ابوطالب میں سب سے پہلے شہید تھے۔

مجلسی کی ”تحفۃ الزار“ کی سولہویں زیارت میں ہم پڑھتے ہیں: ”السلام عليك يا اول قتیل من نسل خیر سلیل من سلالۃ ابراہیم الخلیل“ اس سے جناب علی اکبر کا خاندان بنی ہاشم کے سب سے پہلے شہید ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

۲ عبد اللہ بن مسلم ابن عقیل

۳ محمد ابن مسلم ابن عقیل

بعض مورخین نے شہداء اولاد عقیل میں مندرجہ ذیل افراد کے اسماء درج کئے ہیں:

۴ عقیل ابن ابی طالب

۵ عبد الرحمن ابن عقیل

۶ عبد اللہ ابن عقیل

۷ موسیٰ ابن عقیل

		عون بن عقیل	۸
		علی ابن عقیل	۹
		جعفر بن محمد بن عقیل	۱۰
		احمد بن محمد بن عقیل	۱۱
		محمد بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب	۱۲
		عون ابن عبد اللہ بن جعفر	۱۳
		عبد اللہ ابن عبد اللہ بن جعفر	۱۴
		قاسم ابن محمد بن جعفر	۱۵
		عبد اللہ ابن ابیوسفیان ابن حارث ابن عبد المطلب	۱۶
		عبد اللہ ابن حسن ابن علی ابی طالب	۱۷
		قاسم بن حسن	۱۸
		ابو بکر ابن حسن	۱۹
		عبد اللہ ابن علی	۲۰
		عباس ابن علی	۲۱
		جعفر بن علی	۲۲

۲۳ محمد بن علی

۲۴ عبد اللہ ابن الحسین

۲۵ علی اصغر ابن الحسین

ابن شہر آشوب کا کہنا ہے کہ روز عاشوراء بنی ہاشم کے ستائیں (۲۷) افراد شہید ہوئے لیکن مولانا علی نقی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ بنی ہاشم میں اٹھارہ افراد کا روز عاشوراء شہید ہونا یقینی ہے اور وہ یہ ہیں:

اولاً دام حسینٌ

علی اکبر، عبد اللہ الرضیع

اولاً دام حسنٌ

قاسم، ابی کبر، عبد اللہ

اولاً دامیر المؤمنین

عباس، عبد اللہ، عثمان، جعفر، محمد

اولاً د جعفر

عون، محمد

اولاً د عقیل

عبد اللہ، محمد، جعفر، عبد الرحمن، محمد ابن ابی سعید ابن عقیل

زینب سلام اللہ علیہا

شہادت کی پیغام بر اور انقلاب کے تسلسل کی نشانی

شہداء خاک و خون میں غلطان ہیں۔ ۶۱ ھجری کے محرم کا عاشورہ ختم ہو چکا ہے۔ زینب کر بلا سے آرہی ہیں اور تمثیلہ بنیوں کے شور و غل اور جلادوں کے نغمہ میں گھری، ظلم کے پایہ تخت میں ”خون“ اور ”شہید“ کی بات کرتی ہیں، تاکہ ”عاشورا“ اور ”کربلا“، کبھی ختم نہ ہو، تاکہ ہر روز، عاشورا اور ہر سرز میں، کربلا ہو جائے۔ ۶۱ ھجری کے محرم کا عاشورا ختم ہو گیا مگر عاشورا، ختم نہیں ہوا ہے۔ عاشورا، کبھی ختم نہ ہو گا۔ اس تسلسل کو قائم رکھنے والی زینب ہیں۔ زینب پیغام بر شہادت ہیں جو کربلا سے آرہی ہیں تاکہ ”خون“ کے پیغام کو پہنچا دیں اور ظلم کے پایہ تخت اور ظالم کے دربار میں ”خون“ اور ”پیغام“ کی گفتگو کریں، اور بتائیں کہ اس خون آلو دھرامیں کیا واقعات پیش آئے اور وہ واقعات کیوں پیش آئے اور ان واقعات کا بانی اور پشت پناہ کون تھا اور یہ بھی بتائیں کہ جو ہستیاں اپنے خون میں غلطان پڑی ہیں، وہ کون ہیں، ان کا خون کیوں بہا ہے اور اس خون کے پس پر دہ کون سا مقدس مقصد ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حسینؑ کے انقلاب کی پیغام بر زینب ہیں اور زینب کا پیغام زمانے کی سانسوں کے ساتھ جاری ہے۔

زینب ایک ایسی خاتون ہیں جو پیغام حسینؑ کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں کہ ان کے پیچھے اسیروں کا قافلہ ہے۔ زینب تنہا ہیں، اسی روی کا عالم ہے مگر ان کی شعلہ بیانی ایسے طوفان برپا کر رہی ہے جس سے ظالموں اور جلادوں کی بساط الٹ جاتی ہے۔ زینب حسینؑ کے پیغام کو علیؑ کے انداز میں پہنچا رہی ہیں۔ حسینؑ کا پیغام کیا تھا؟ ظلم اور ظالموں کو ذلیل کرنا، اسلامی بنیادوں کا تحفظ اور اسلام کو خلافت سے جدا کر دینا۔ زینب اپنے شعلہ بار خطبوں کے ذریعہ بازار کوفہ و شام اور ابن زیاد اور ریزید کے دربار میں اس پیغام کو بڑی خوش اسلوبی

سے پہنچا رہی ہیں۔ حسینؑ کے پیغام کو زینب علیؓ کے لب والجہ میں بیان کر رہی ہیں۔ خطبات کی شعلہ فشانی ظالموں کے سروں پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ بشیر بن حریم اسدی کہتا ہے:

”عرب کی تاریخ میں بھی کسی عورت نے ایسی تقریر نہیں کی اور لوگوں کو علیؓ یاد آگئے، ایسا لگ رہا تھا جیسے خود علیؓ تقریر کر رہے ہوں۔“

زینب کا وہ مقصد اور یہ وسیلہ! کربلا کی یہ شیر دل خاتون اپنے فریضہ کو انعام دینے میں کہاں تک کامیاب ہوئی؟ اس عظیم کامیابی کو سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ حکومت بنی امية اور سلطنت بنی عباس کا زبردست پروپیگنڈہ بھی خون حسینؑ کو زیر میں پوشیدہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور محشر تاریخ میں خون شہید کا ہر قطہ مشعل بکف ظاہر ہو گا اور باطل و ظلم کی تاریکیاں اس کو چھپانے سکیں گی۔ جناب زینب نے بھی اس خون بہادری کو زندہ رکھنے میں اساسی کردار ادا کیا۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے قabilیوں کو کسی طرح بھی ہابیلیت کو تھہ خاک چھپانے نہ دیا۔ انہوں نے شہادت کا پیغام ساری دنیا کے کانوں تک پہنچا دیا۔ زینبؓ انقلاب کے تسلسل و بقا کی نمایاں نشانی ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ انقلابیوں کی موت کے ساتھ انقلاب ختم نہیں ہوتا بلکہ اسی سے شہیدوں کی فتح کا آغاز ہوتا ہے۔ زینبؓ محض تسلسل انقلاب کا مظہر ہی نہیں ہیں بلکہ نظام ظلم واستبداد کو ناکام بنانے والی بھی ہیں۔ انہوں نے ظالم کو اس کی ہونے والی نشست سے مطلع کر دیا۔ اگر زینبؓ نہ ہوتیں، تو یہ خون حسینؑ کی سرخی کو کربلا تک محدود رکھنے میں کامیاب ہو جاتا، مگر زینبؓ نے اس خون کی سرخی کو آفاق زمانہ کی بلندیوں پر پھیلا دیا اور ظالم کو اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس خون کو چھپا سکے۔

حضرت زینبؓ کی شجاعت

زینبؓ کی شجاعت کا اندازہ لگانے کے لئے سب سے پہلے اس زمانے کے حالات پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس زمانے میں ظلم و جور کا ایسا راج تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بڑے

بڑے شمشیر زن، دلاور اور سور ما اصحاب گوشہ عافیت میں چھپ گئے تھے اور دامن عبادت و ریاضت میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حسینؑ عظیم ترین معیار حرق و باطل اور اسلامی قدریوں کے علمبردار ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انھیں حسینؑ کے نقش قدم کو نمونہ بنانے کا کیا بروی کرنا چاہئے مگر اس کے باوجود وہ ظالم کے نیزہ و شمشیر کے خوف سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ خبر و شمشیر اور ظلم و ستم کے بوجھ تئے عوام اس قدر بے ہوئے تھے کہ وہ بھی نہیں سکتے تھے۔ قیامت، خشونت اور قتل عام کے ذریعہ سب کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اس وقت زینبؓ جو اپنے بہتر ۲۷ راعزا کی شہادت دیکھ چکی ہیں اور ان ظالموں کے سبق میں تھا ہیں اپنے اقدام کو اس قدر قطعی، واقف کارانہ اور پنے تلنے انداز میں پیش کرتی ہیں جس کی نظری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

زنب علیؓ و فاطمہؓ کی بڑی بیٹی، انہیں کی آغوش کی پروردہ ہیں۔ امیر المؤمنینؑ نے جناب زینبؓ کو اپنے سمجھتے عباد اللہ بن جعفر کے نکاح میں دے دیا۔ مختلف تاریخی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر المؤمنینؑ کو جناب زینب سے خصوصی انسیت تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک حساس دور میں وہ اسلام کی علمبردار ہوں گی اور تحریک مجددی و علوی کو دوام بخشنیں گی۔ امیر المؤمنینؑ نے حضرت زینبؓ کو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ رکھا۔ جیسا کہ اپنی زندگی کے آخری رمضان میں انہوں نے ان ہی تین بچوں کے گھر اپنا افطار رکھا۔ مدینہ سے کربلا تک زینبؓ ہر مرحلہ پر حسینؑ کے ساتھ رہیں۔

جناب زینبؓ کی اہم ذمہ داری

حضرت زینبؓ کی اصل ذمہ داری عصر عاشورا کو ”شام غریبان“ سے شروع ہوتی ہے اور کوفہ و شام اور دربار ابن زیاد و یزید میں اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ زینبؓ کے فرائض کی دشواری قابل غور ہے۔ ایک عورت جس کے گھرانے کے بھائی، بچے اور عزیز سب اس کی آنکھوں کے سامنے بیدردی سے شہید کر دیئے گئے اور خود دشمنوں کی زنجیروں کی قید میں ہے، جس کے ساتھ

اسیروں کا قافلہ ہے، جس کی حدِ نگاہ تک افواجِ شمن کی صفائی ہیں، جو شمن کے شہر اور ظالم حاکم کے پایہ تخت میں ہے مگر حق اور حقیقت کا اعلان کر رہی ہے۔ جناب زینبؓ کس بہت و شجاعت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتی ہیں۔ حقیقتاً زینب وہ خاتون ہیں جن سے مردوں کو بھی درس شجاعت لینا چاہئے۔

شہادتِ حسینؑ کے بعد جب زینبؓ کا پنے کاندھوں پر ذمہ داریوں کے بوجھ کا احساس ہوا تو بالکل بدل گئیں۔ تاریخی کتابیں اور مقالیں کے مطابق شہادتِ حسینؑ سے قبل زینبؓ کو چند بار غش بھی آیا تھا۔ وہ اشکلبار بھی ہوئی تھیں۔ ایک واقعہ کے مطابق جس کا ذکر تاریخ میں تفصیل سے ہے، جس وقت امام حسینؑ کی زبان پر ایسے اشعار جاری تھے جو شہادت کی خبر دیتے تھے اور یہ اشعار جب حضرت زینبؓ نے سنے تو کہا: ”کیا میرا بھائی اپنی موت کی خبر مجھے دے رہا ہے؟“ اور یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئیں۔

روز عاشوراً جو شہید خاک پر گرا، زینبؓ نالہ کنان اس کی بالیں پر تشریف لے گئیں، اس کی تکلیف پر آنسو بہائے اور اس پر مرثیہ پڑھا۔ مگر وہی زینبؓ شہادتِ حسینؑ کے بعد قطعی طور پر بدل گئیں۔ کسی بھی مقلد یا تاریخی کتاب سے اس بات کی گواہی نہیں ملتی کہ انہیں شہادتِ حسینؑ کے بعد بھی کبھی غش آیا ہو۔ زینبؓ خونِ شہداء کی ذمہ دار وارث ہیں۔ شہیدوں کے بعد صرف وہی ہیں جو کربلا کے ریگزار پر سونے والوں کی زبان ہیں، یہ زینبؓ ہی ہیں جو اپنے بھائی کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ پر سکون، فتح اور فخر سے لبریز ہیں اور طاقت و ظلم کا مضمکہ اڑا رہی ہیں۔ زینبؓ نے اپنے فرض کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا اور فاتحِ حسینؑ اور ان کے رفقاء کے پیغام شہادت کو اتنی زور سے فراز آسمان پر اچھالا ہے کہ اس کے دھماکے کی آواز تا قیامت، زمانوں اور فضاوں میں گونجتی رہے گی۔ خود اپنی فریاد کی گرج سے انہوں نے محلوں کی دیواریں ہلا دیا اور ظالموں کے پیروں تلنے زینبؓ کو متنزلزل کر دیا۔ ہاں یہی حقیقت ہے کہ زینبؓ پیغمبر شہادت اور حسینؑ کی تحریک انقلاب کی محافظ ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام تحریک کر بلاؤ جاری رکھنے والے

امام زین العابدینؑ، سید الساجدین، عاشور کے بعد کے ہیر و اور کربلا میں رونما ہونے والے واقعات کے بے مثال شاہد نے اپنی ذمہ داری کو دعا کے ذریعے پورا کیا۔ پیغام کربلا کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے دعاوں کا اسلوب منتخب اور دعاوں سے اپنے چہاد کا مورچہ تیار کیا۔ امام زین العابدینؑ گھٹن کے دور میں جدوجہد کے ایک عظیم معلم ہیں۔

واقعہ کربلا کے بعد شیعہ اور شیعہ قیادت سخت حالات سے دوچار ہوئے اور ظلم مکمل طور پر عوام کے حالات و تقدیر پر حاوی ہو گیا تھا۔ کسی قسم کی تحریک یا چہاد کا امکان نہ تھا۔ زمانے کے حالات اور حاکم کے اقتدار کے خلاف آخری انقلاب، آخری پرزو و عزم اور احتجاج جو امامؑ نے کیا وہ بظاہر ختم ہو چکا ہے۔ سب قتل ہو چکے ہیں۔ اور ان انقلابیوں میں سے بظاہر صرف ایک جوان یعنی زین العابدینؑ زندہ بچ گئے تھے۔

ظاہراً امام زین العابدین علیہ السلام کے لئے کسی بھی طرح کی کوشش کا کوئی موقع نہیں تھا اور جدوجہد کو آگے بڑھانے کی کوئی امید نہیں تھی اور فرائض کی انجام دہی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ امام زین العابدینؑ کا دور عبد الملک بن مروان اور ولید بن عبد الملک جیسے طاقتو اموی خلفاء کا دور تھا جس میں جاج جیسا ظالم و جابر اور خون آشام حاکم موجود تھا۔ عبد الملک نے کوفہ اور بصرہ کی گورنری جاج کے پر درکردی تھی اور جاج کا یہ عالم تھا کہ جس پر بھی اہل بیتؑ سے وابستہ ہونے کا سے شہہر ہو جاتا اس کو بلا تامل اور بے دریغ تھے تفعیل کر ڈالتا تھا۔ وہ ”اذیت رسانی“ اور خونواری میں متکل عباسی کی

نظیر تھا۔ ابن اشیر ”کامل“ میں لکھتا ہے کہ حاج بن یوسف شفیقی نے اپنے دور اقتدار میں بیس ہزار سے زیادہ افراد کو تبعیغ کیا جن میں اکثریت شیعوں کی تھی۔

اس زمانے میں شیعوں کے اس بیداری سے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کی وجہ یہ تھی کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد واقعہ کر بلکہ نتیجہ میں شیعوں کی متعدد تحریکیں وجود میں آگئی تھیں۔ سب سے پہلے تو شہادت امام کے فوراً بعد ^{۲۳} ہتھ تک یہ سلسلہ جاری رہا^(۱) اس کے بعد انقلاب مختار سامنے آیا اور مختار نے قاتلان حسینؑ میں سے بیشتر کو واصل جہنم کیا۔ خود ابن زید بھی مختار کی ششیر سے قتل ہوا۔^(۲) یہی عوامل شیعوں پر ظلم و ستم اور ان کی سرکوبی کا باعث تھے۔ سماج کے ظاہری حالات کی وجہ سے اسلامی تحریک کے مٹ جانے اور فراموش ہونے کا خطرہ تھا اور پیغمبرؐ و اماموںؐ کا مقصد خطرے میں تھا۔ تمام تبلیغاتی، دینی اور دنیوی وسائل امویوں کے ہاتھ میں تھے۔ حکومت، محراب، منبر، مسجد، قفات (نچ)، حکام اور لشکر سب کچھ خلیفہ کے قبضہ میں تھا اور اس اقتدار اور قوت کے مقابلے میں امام زین العابدینؑ تنہا تھے۔ دہشت گردی، وحشت، جرم اور قتل عام نے کسی بھی عملی تحریک کو ناممکن بنا رکھا تھا۔

جس دور میں امام زین العابدینؑ زندگی گذار رہے تھے، وہ دور ”مطلق معدوری“ کا دور تھا۔ امام ایسے مشکل حالات سے دوچار تھے کہ شہادت کا انتخاب بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ”شہادت“ یا ”جهاد بالسیف“ کے کچھ شرایط ہوتے ہیں: شہادت یعنی ایسی موت کا انتخاب جو اسلحہ کی صورت میں تبدیل ہو سکے اور اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ مسلمان کشور کشاںی کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے، ظالم کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ عبد الملک جیسا جابر تخت خلافت پر بیٹھا ہوا تھا اور امام کے پاس نہ عباس و علی اکبر جیسے مدگار تھے نہ زینب جیسی پیغام رسال۔ ان حالات میں شہادت ایک خاموش موت ہوتی نہ کہ ظلم کو کھلنے کے لئے ایک اسلحہ۔

(۱) بلاذری، انساب الاشراف، ج ۵ ص ۲۰۶

(۲) ابن قتیبہ، الامامة والسياسة، ج ۲ ص ۲۳

اس صورت حال میں سید سجادؑ نے جہاد کو آگے بڑھانے اور دوام بخشنے کے لئے ”دعا“ اور ”اشک“ کی حکمت عملی کو اپنایا۔ حکومت اور ظلم پر حملہ کرنے کے لئے ان اسلحوں کو اپنایا تاکہ اصلی اسلامی قدروں اور نظریات کا تحفظ کیا جاسکے۔ امام نے ”دعا“ سے کربلا کو دوام بخشتے ہوئے ظالم حکومت اور فکری، عقیدتی اور سیاسی انحرافات پر حملہ کیا۔

سید سجادؑ دعاوں کے اسلئے ارشکوں کی شمشیر سے ظالموں اور جباروں کے خلاف مصروف جنگ ہوئے اور اس طرح انہوں نے سنت شہدا کو نہ فراموش ہونے دیا، نہ کارنامہ حسینؑ کو ہندو اپسین کی فتح کے شور میں گم ہونے دیا۔

ان نازک حالات میں امامؑ نے تحریک کی رہبری کے تحفظ کی خاطر بظاہر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی اور کسی تحریک یا قیام کی علانية پشت پناہی نہیں کی مگر اکثر مستند شواہد سے ظاہر ہے کہ انقلابی ان ہی حضرتؓ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے جیسا کہ مختار نے بھی ابن زید کے قتل کے بعد اس کا سرجب خدمت امامؑ میں مدینہ بھیجا تو امامؑ نے مختار کے اس اقدام پر رضا مندی کا اظہار کیا۔ ایک بہت بڑا مورخ یعقوبی لکھتا ہے: ”ان علیاً لم ير ضاحكا قط منذ قتل ابوه إلا في ذلك اليوم“ یعنی امام زین العابدینؑ کو ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد سے کبھی کسی نے ہستے نہیں دیکھا سوائے اس روز کے۔

امامؑ نے کسی سیاسی تحریک یا انقلاب میں اعلانیہ شرکت کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سانحہ کر بلکہ بعد مجاز حق سے متعلق سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ تحریک کی رہبری اور شہیدوں کے خون کے پیامی کا وجود قائم رہے اور اس حساس اور پرآشوب دور میں جب شیعوں کا قتل عام علی الاعلان جاری تھا، تحریک کی رہبری محفوظ رہ جائے۔ امام حسینؑ نے جو اقدام کیا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہو جو اس پیغام کو منتقل کر سکے اور اس وقت تک اس کی حفاظت کرے جب تک کہ اس کی ذمہ داری امام باقرؑ اور امام صادقؑ تک نہ پہنچ جائے اور وہ اسے نظام کی مصلحتیں تھیں جو امام زین العابدینؑ نگاہ امامت سے دیکھ رہے تھے حالانکہ محمدؐ شکل دے دیں۔ یہ وہ

بن حنفیہ کو اس کا عرفان نہ ہو سکا تھا۔ امام زین العابدین بظاہر سیاسی مسائل سے دور تھے مگر حقیقتاً عصری نظام حاکم سے فکری اور نظریاتی بالواسطہ مقابلہ (مہا بھارت) میں مصروف تھے۔ امام زین العابدین نے خون شہداء کی پیغام رسانی میں جناب زینب کے ساتھ شریک تھے۔ امام چہارم جناب زینب کے ساتھ ساتھ دربار کوفہ و شام میں اپنی تقریر اپنی رفتار و گفتار غرض کہ ہر طرح پیغام شہداء کی منتقلی کے فرائض کو انجام دیتے رہے اور جناب زینب ہی کی طرح آپ بھی ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ واقعات کر بلا اور مقصد شہادت حسینؑ دنیا کے ذہنوں سے فراموش نہ ہونے پائے۔

سید سجادؑ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ باطل نظام کی بیخ کنی میں صرف کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے امام کا اصلی ہتھیار، خطبہ اور دعا تھا۔ چنانچہ دربار یزید میں امام کا خطبہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ جب انہوں نے فضائل پیغمبر اور اہل بیت کے لئے اپنی زبان کھولی تو ان کا ہر جملہ یزیدی اور اموی نظام پر ایک ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ یزید جو ابوسفیان کا وارث تھا اور جو محمدؐ کے مقابلہ پر تھا اور اہل بیت کے حقوق کا موروثی غاصب بھی تھا۔ نیز جب امام دعاوں میں محمدؐ وآل محمدؐ کے فضائل بیان کرتے ہیں تو حقیقتاً یہ بالواسطہ طور سے جامیل قدر روں کے حامل اور اہل بیت کے دشمنوں پر ایک حملہ ہے۔

صحیفہ سجادیہ کی دعاوں کا تجربہ

سید سجادؑ اپنی دعاوں میں ایک طرف تو اسلامی بنیادی تعلیمات کو زندہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف ظلم کے خلاف جنگ کی مشعل کو بھی بھجنہیں دیتے۔ صحیفہ کاملہ کی دعاوں میں سید سجادؑ نے شیعہ عقیدہ کے تمام اصول یعنی معرفت خدا، نبوت، توحید اور امامت سے لے کر عدل و قضاؤ قدر تک بیان فرمائے ہیں۔ مسلمانوں کو ظلم اور ظالم کے خلاف بیدار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خواہ تمام فکری و اجتماعی قوتیں حاکم کے قبضہ قدرت میں کیوں نہ ہوں پھر بھی ایک مسلمان حریم اسلام کے

□ دفاع کے لئے ظالموں سے نبرد آزمائی کا فرض ادا کرنے پر مجبور ہے۔

صحیفہ سجادیہ کی دعا نئیں انسانوں کے اجتماعی اور سیاسی درود راز و نیاز کی صورت میں بیان کرتی ہیں۔ امام دعاوں میں بار بار ”نظام صالح“ اور ”حکومت حق“ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شہیدوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور ان پر درود بھیجتے ہیں۔ درمیان میں روئے تھن منصفوں اور انصاف چاہئے والوں کی جانب ہو جاتا ہے اور یہ ساری باتیں حاکمان وقت کے اوپر ضرب کاری ہوتی ہیں۔ سیاسی فضا کے اعتبار سے امام موجودہ یا سابق کے حکمرانوں اور ان کے دربار کی براہ راست مذمت نہیں کرتے تھے مگر حق و عدالت کے مورچوں کے گھبائوں کو مخاطب کرتے ہوئے موجودہ نظام اور مطلوبہ نظام کا فرق ظاہر کر دیتے تھے تاکہ سننے والوں کو ”موجودہ“ اور ”مطلوبہ“ نظام کے درمیان مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور اموی حکومت کی خرابیاں ظاہر ہو جائیں۔

صحیفہ کاملہ کی دعا نئیں انسان کو سماج سے گریزاں نہیں کرتیں، نہ انسان کو معاشرے سے دور کر کے عزلت نشین پر مجبور کرتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس انسان میں روح عمل کو بیدار کرتی ہیں۔ صحیفہ سجادیہ کی دعا کو ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ”خدا یا ہمیں قوت عطا کرتا کہ ہم سنت پیغمبرؐ کی حفاظت کریں، بعد عنوان سے نبرد آزمائوں اور امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کو انجام دیں“، وغیرہ وغیرہ۔ صحیفہ کاملہ کی دعاوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے گوشه نشین عابد کی دعا نئیں ہیں جو معاشرے اور اجتماع سے گریزاں ہے بلکہ یہ امام زین العابدینؑ کی دعا نئیں ہیں جو امام مجاهدین بھی ہیں۔

امام ان دعاوں میں کھلمن کھلایفہ یا اس کے دربار کا نام نہیں لیتے مگر ایک ایک خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مذمت ضرور کرتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد اس نظام کی حقیقت کو آشکار کرنا اور اسے روکنا ہے۔

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ هِيَجَا الْحُرُصِ— وَالْحَاجَ الشَّهْوَةِ وَالْقَاطِيِّ
الْكَلْفَةِ وَإِيَّاشَ الْبَاطِلِ عَلَى الْحَقِّ— وَسُوءَ الْوِلَايَةِ لَمْ تَحْتَ أَيْدِينَا—
يُعْنِي ”خداوند! تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ لائچ ہم پر غلبہ پاجائے، نفس پرستی ہم پر

سلط ہو، ہم تجھل پرستی اختیار کریں، حق کی موجودگی میں باطل کا انتخاب کریں اور جو ہماری ولایت حاکمیت میں ہیں ان سے بر اسلوک کریں۔ اس دعا کا ہر جملہ نظام اموی پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد حکومت کے عملہ اور ارکان کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں: او نعضد ظالماؤ نخذل ملھو فاً یعنی خدا یا ہمیں ان لوگوں میں قرار نہ دے جو ظالموں اور جا بروں کا ساتھ دیتے ہیں اور ظالموں کو بے سہارا پھوڑ دیتے ہیں^(۱) ”لاتجعل للظالمين ظهيراً“ یعنی تم گاروں کا پشت پناہ نہ قرار دے، اس طرح صحیفہ کاملہ میں سید سجادؑ نے دعاوں کی صورت میں تمام اجتماعی اور سیاسی سماجی درد کا اظہار کر دیا ہے۔

صحیفہ کاملہ کی دعاوں کے تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید سجادؑ حاکم طبقہ کے صفات کا اظہار اور ان کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے اسلامی معاشرے کو اپنا معاشرہ بھی سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ پوری امت کی فکر میں رہتے ہیں۔ سیاسی مسائل اور سرحدوں کے حالات بھی زگا ہوں سے دور نہیں ہیں۔ صحیفہ کاملہ کی ستائیسویں دعا جو مفصل ترین دعاوں میں سے ایک ہے اسی قلمرو کی سرحدوں کے ٹکھباؤں کے لئے مخصوص ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”خداؤندا! مسلمانوں کی سرحدوں کو عزت کے ساتھ قائم رکھ، خدا یا ان سرحد کے ٹکھباؤں کو اپنی قوت سے مدد دے، خدا یا اپنی عنایت سے ان کے حقوق میں برکت عطا کر، خدا یا ان کی تعداد بڑھا، خدا یا ان کے اسلحہ کو کاث عطا کر، ان کی جماعت کی حفاظت کر، ان کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کر اور ان کی کارسازی کر۔“

اسی دعا سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ایسے نہ تھے جو گوشہ نشینی میں ہوں اور انہیں پوری امت کی فکر نہ ہو۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف محمد رضا حکیمی بتاتے ہیں کہ اس دعا میں مسلمانوں کے لئے اتحاد و عبرت کا درس موجود ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اس دعا میں ہر جگہ ”مسلم“، ”مسلمین“، اور ”ہل ثغور“ یعنی سرحد اور قلعہ کے محافظ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جو مسلک و فرقہ سے ہر اس شخص

کے لئے ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ پڑھتا ہے، سیاست اسلامی کے نقطہ نظر سے یہ ایک بہت بڑی اور گہری تعلیم ہے تاکہ تمام مسلمان، شیعہ و سنی اس بات کو سمجھ لیں کہ جہاں دنیاۓ اسلام کا معاملہ ہو اور خارجی دشمن مقابله پر ہو تو مصالح اسلام کو وسیع انظری سے (گروہ اور فرقہ سے قطع نظر) سوچنا چاہئے۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے ان مصالح کی ہمیشہ رعایت کی ہے اور شیعی حق و معارف کی نشر و اشتاعت کے ساتھ ساتھ اسلام اور تمام مسلمانوں کے مصالح سے کچھ چشم پوشی نہیں کی ہے۔ اب ہم شیعوں کو چاہئے کہ اس تعلیم کو اپنا شعار بنالیں۔ کوئی مصنف، کوئی واعظ اور کوئی مقرر اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ وہ دین اور تشیع کے نام پر مصالح اسلام سے چشم پوشی کرے اور ائمہ کی ولایت کے نام پر ائمہ ہی کے دستور کو روندڑا لے۔ یہ تمام باتیں فرائض شیعی سے، دین کے حقیقی مقاصد سے، ائمہ کے دستور و میراث سے، دنیا کے مسائل اور عالمی سیاست سے ناواقیت اور جاہلیت کی پیداوار ہیں۔^(۱)

سید سجادؑ صحیفہ کاملہ کی دعاوں میں نظریات، ذمہ داریاں، شعار اسلام کی حقیقی ضروریات، حکومت اور مخالف اجتماعی قوتوں کے خلاف مورچہ بندی کا اعلان کرتے ہیں اور تمام اسلامی دستور اور شیعہ اصولوں کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اس طرح سید سجادؑ یہ بتا رہے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کو کسی زمانے اور کسی حالت میں پر آشوب ماحول کو فرائض اور جدوجہد سے فرار اور گوشہ نہائی میں بیٹھنے کا بہانہ نہیں بنانا چاہئے، بلکہ اسے چاہئے کہ ہر حال میں موجودہ زمانہ اور حالات کے مطابق مقابله کے نئے طریقے ایجاد کرے اور انہیں بروئے کار لائے۔ ان حالات میں جبکہ اموی ظلم و تم اور جبر و تشدد اپنی انہتہ پر تھی اور عبد الملک اور ولید جیسی جنہیں تو تیں ایشیا یورپ اور افریقہ پر حکمران تھیں، سید سجادؑ نے دعاوں اور اشکوں سے سلسلہ جہاد کو جاری رکھا، جہاد حسینی کی مشعل کو بجھنے نہ دیا اور کربلا کے کارنا موں کو جن کی یوم عاشورا کے بعد سے زینب نے حفاظت کی تھی حکومت کے پروپیگنڈہ اور شور و غل میں فراموش نہیں ہونے دیا۔

(۱) امام در عینیت جامعہ، ص ۳۴۳ و ۳۴۴

(۱) رجوع کیجئے: امام در عینیت جامعہ، ص ۲۸۶ و ۲۹۰

سید سجاد نے آئندہ نسلوں کو یہ ہن نشین کرایا کہ جودور مطلاقاً مجبوری کا دور ہو، ایسے دور میں بھی اگر مسلمان صاحب ارادہ اور ذمہ دار ہو اور کامیابی حاصل کرنا چاہے تو حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اسلامی جہاد کی لغت میں ”چاہنا“، ”سکنے“ کی ضمانت ہے۔

میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ سید سجاد کا زمانہ نہایت ہی پر آشوب زمانہ تھا، حتیٰ کچل دیا گیا تھا اور حق پرستوں کا قتل عام کر دیا گیا تھا، حکومتی مذہب مسلط ہو گیا تھا۔ حکومت کی فوجیں تمام قلمرو اسلامی پر قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ لوگوں کی توجہ کشور کشانی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ان حالات میں مقابلہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ مگر سید سجاد بتاتے ہیں کہ ان ناساز گارحالت میں بھی مقابلہ ہو سکتا ہے، اور مقابلہ کرنا ہی چاہئے۔ اور ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی ہے۔ سید سجاد نے امت محمدی کو یہ درس دیا ہے کہ اگر وہ حادثہ کر بلے کے بعد کے حالات سے بھی دو چار ہو اور تمام افراد سوائے ایک فرد کے قتل ہو جائیں اور دین کی حفاظت کے لئے کوئی نہ بچ سوائے ایک فرد کے تو یہ ایک فرد بھی فرائض کی انجام دی سے مستثنی نہیں ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ مقابلہ کی راہیں نکالے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید سجاد صرف زین العابدین ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخی مجاہدین کے سردار اور سربراہ بھی ہیں۔ بعض ذاکرین کے بیانات سے عوام کے ذہنوں میں سید سجاد کی جو تصویر آتی ہے، اس سے ایک بیمار اور کمزور انسان کا تصور بھرتا ہے۔ حالانکہ یہ حق ہے کہ حادثہ کر بلے کے دوران سید سجاد کچھ دنوں تک بیمار تھے اور یہ بھی مصلحت ایزدی تھی کہ اس ترتیب سے دارثان امامت میں سے ایک وارث شہیدوں کے پیغامات کو پہنچانے اور امامت کی رہنمائی کے لئے باقی رہ جائے، مگر اس وجہ سے ان کے سلسلے میں ایک دائم المرض کی تصویر کھینچ دینا تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ امام بہت ہی قلیل مدت تک بیمار رہے۔ اس کے بعد دیگر ائمہ کی طرح امامت کے فرائض کی انجام دی میں مصروف ہو گئے۔

موسسه در راہ حق سے شائع ہونے والی کتاب ”پیشوائے چہارم، امام سجاد“ (ص/۱۶) میں اس سلسلہ میں لکھا ہے: ”بہت سے انجان لوگ جب امام چہارم کا نام لیتے ہیں تو اس کے ساتھ

بیمار کا لقب بڑھادیتے ہیں۔ شاید وہ بھی سمجھتے ہیں کہ امام ہمیشہ بیمار ہی رہا کرتے تھے اور اسی وجہ سے بعض لوگ اپنے ذہنوں میں امام سے متعلق ایک ایسے انسان کا تصور رکھتے ہیں جو بہت بیمار، نجیف، نذر حال ہوا اور جس کا چہرہ ضعف سے زرد ہو رہا ہو۔ حالانکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے۔ جو لوگ تاریخ اور امام کی زندگی سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ تمام عمر بیمار نہیں تھے، صرف کر بلے میں کچھ عرصہ تک بیمار تھے۔^(۱)

محمد رضا حکیمی لکھتے ہیں: ”ایسے تمام ذاکرین جو امام سجاد کو بیمار اور نجیف شکل میں پیش کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چند افراد کو لاد دینا حقیقت کو سُخ کر دینے سے زیادہ اہم ہے۔ مقدس پیشوائوں اور کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے مصائب کے سلسلہ میں اس طرح کے متاثر اخذ کرنا، شیعہ عقائد سے خیانت، ائمہ کی عظیم شخصیت کی توہین اور تاریخ کے بہادر اور شجاع افراد کے حق میں ایک جرم ہے۔“

جس شخص کی ایک بیار و نتوال کی شکل میں تصویر کشی کی جاتی ہے، یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کی شعلہ بار تقریروں سے ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر حاکم کا دربار لرز جاتا ہے، جو سماجی و سیاسی مسائل کے لئے دعا گور ہتا ہے اور جس کے زیر سایہ انتقلابی کارنامہ انجام دینے والے بزرگوں نے پروپریٹی پائی ہے۔ امام محمد باقر جو باقر العلوم، مددوین مکتب کا آغاز کرنے والے تھے اور جناب زید جنہوں نے دین و مذہب کے لئے قیام کیا اور بے مثال کارنامہ انجام دیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔

امام کے عرفانی پہلو اور علمی بلندی

امام نہ صرف معاشرے کی سماجی و سیاسی ضروریات کی طرف متوجہ رہا کرتے تھے اور اجتماعی زندگی میں عملاً شریک رہتے تھے، بلکہ باطنی درجات اور عرفان کی گہرائیوں میں بھی درجہ کمال پر فائز تھے اور خدائی منع علم سے براہ راست اکتساب فیض کرتے تھے۔ امام کی باطنی اور روحانی کشش

(۱) پیشوائے چہارم (ناشر: موسسه در راہ حق) ص ۱۷۱ اور ۱۸۸

بھی لوگوں کو سید ہے راستے کی طرف ہدایت کرتی تھی۔ ائمہ پر خدا کی خصوصی عنایت ہوا کرتی تھی اور معارف باطنی پر انہیں پورا اختیار حاصل تھا۔ امام چہارم کی کرامات کی ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف آپ کی موجودگی سے لوگوں نے ہدایت پائی ہے۔

سید سجاد عبادت و ریاضت کے لئے اس قدر مشہور تھے کہ آپ کو ”سید سجاد“ اور ”زین العابدین“، جیسے القاب ملے۔ بعض روایات سے امامؐ کے عرفانی حالات کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی ایک روایت کے مطابق امامؐ کی عرفانی حالت کا یہ عالم تھا کہ حج کے موقع پر احرام باندھتے وقت کلمہ ”لبیک“ کہتے ہوئے امام پر لزرہ طاری ہوا اور یہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ سب لوگ متوجہ ہو گئے۔ جب امام سے اس حالت کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے جواب دیا: ”میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں لبیک کہوں اور جواب میں ”اللابیک“ سننے کو ملے۔“

جو لوگ اس قدر گھرے عرفانی حالات کے حامل ہوتے ہیں، وہی اس دنیا کے برگزیدہ ترین لوگ ہیں، ان کے عمل کے مقابلے میں بہشت کم مایہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے کو پروردگار عالم کے حضور میں پاتے ہیں۔ علمی کارناموں اور منزلوں کے لحاظ سے بھی امام سجاد ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ دعا کے ذریعے ہدایت کے علاوہ ایسے شاگرد تیار کئے جو اسلام کے پیغام حقیقی کے محافظ اور شیعی عقائد کے مبلغ تھے۔ سعید ابن مسیب، سعید بن جبیر یہ دو شیعہ فاضل امام چہارم ہی کے پروردہ تھے۔ امامؐ سے ”صحیفہ کاملہ“ کے علاوہ ”حقوق“ کے موضوع پر ایک رسالہ بھی نقل ہوا ہے جو ”تحفۃ القول“ میں تقریباً مکمل درج ہے۔

اس طرح سید سجاد اسی تحریک کو جاری رکھنے والے تھے جس کی راہ میں علی، حسنؐ اور حسینؐ شہید ہوئے۔ حسینؐ نے ”شہادت“ کو زینب نے ”خطبات“ کو اور سید سجاد نے ”دعا“ کو پیغام رسانی کا وسیلہ بنایا۔ سید سجاد نے اپنی رفتار، گفتار، خطبات، دعا اور آنسوؤں سے تحریک کی روح کو زندہ رکھا، لوگوں میں نظریاتی بیداری اور عظیم فرائض کی انجام دہی کے لئے زمین ہموار کی، وہ بھی اس زمانے میں جب سارا ”اقتدار“ ڈسٹریکٹ کے ہاتھ میں تھا۔ صحیفہ کاملہ کی دعاوں کو اسلام کی انقلابی

تہذیب کے نعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سید سجاد دعاوں کے اسلوب سے کار حسینؐ انجام دیتے ہیں اور یزیدوں کے لئے امن و امان کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتے۔
باطل کو رسوا کرنے کے لئے حسینؐ نے ”خون“ کا اسلوب جنگ اپنایا، زینب نے ”خطابات“ کا اور زین العابدینؐ نے ”دعا“ کا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فلکی انقلاب کے علمبردار

آسمان ولایت کے پانچویں خورشید کا نام محمد اور لقب باقر ہے۔ ہمارے ائمہ میں صرف محمد باقر ہیں جو پدروادرونوں طرف سے پیغمبر گرامی کی اولاد ہیں۔ آپ کی والدہ حضرت ام عبد اللہ امام حسنؑ کی دختر گرامی تھیں۔ امام باقرؑ ۵ یعنی امام حسنؑ کی شہادت کے پانچ سال بعد اور عاشورائے حسینؑ سے چار سال قبل پیدا ہوئے۔

پیغمبرؓ دین لائے، علیؑ اور حسنؑ نے ”جہاد“ و ”صلح“ کے ذریعے ”جالیت کی بغاوت“ اور امویوں کے بدر ترقی گھاؤ کرنے والے جراحیم کا مقابلہ کیا اور مكتبے کے اصحاب کی حفاظت کی کوشش کی۔ امام حسنؑ نے دوسرے اسلحے یعنی شہادت کے ذریعہ خوابیدہ مسلمانوں کو جگایا اور دین کے پودے کو اپنے خون سے سینچ کر بار آور کیا۔ اور اس کے پھولے پھلنے کی ضمانت لی۔ جناب زینب اور سید سجادؑ (خون حسینؑ) کے پیغامبر تھے۔ انہوں نے اپنے فرائض کو ”خطابات“ اور ”دعا“ کے ذریعہ انجام دیا۔ یہاں تک کہ دین کی تدوین و اشاعت کی باری آئی۔ اس عظیم ذمہ داری کا بار امام محمد باقرؑ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔

امام محمد باقرؑ اور اشاعت دین

دین کی استدلالی تدوین و اشاعت چند اعتبار سے بہت ضروری تھی:

(الف) اولاً اس وجہ سے کہ اس سے پہلے کے دور میں جہاد بالسیف، سیاسی اقتدار اور ظلم و ستم، مصائب اور گھنٹن کے ماحول میں ائمہ اہل بیتؑ کے نقطہ نظر کی تدوین و استدلالی انداز میں اشاعت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اکثر ذہنوں میں شیعہ عقائد کے اکثر گوشے واضح نہیں

ہو سکے جب کہ اس کے انقلابی اور نزاری پہلوز یادہ سختی کے ساتھ ذہن نشین تھے۔ ان عقائد اور فکری بنیادوں کا غیر واضح ہونا انحراف اور تفرقہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس زمانے میں شیعوں میں کیسانیہ اور زیدیہ کی طرح دوسرے فرقے بھی وجود میں آگئے تھے۔ ان مسلکوں اور فرقوں کی تمام تر توجہ سیاسی اور جنگی مسائل کی جانب تھی اور عقیدہ امامت سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ حقیقی ائمہ کی رہبری سے دور تھے۔ ان اسباب کی وجہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ جلد از جلد فقہی و کلامی مسائل کی اشاعت کے لئے شیعی نظریات کی تدوین ہو جائے۔

(ب) گذشتہ ہادیان دین کی کوششوں کے نتیجہ میں بالخصوص عاشورائے حسینؑ کے بعد سیاسی نقطہ نظر سے شیعہ کافی مضبوط ہو گئے تھے۔ ان کا وجود دائیٰ شکل اختیار کر چکا تھا اب اس بات کی ضرورت تھی کہ ان کی فکر، عقیدہ اور تہذیب کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے۔

(ج) ”مکتبہ فکر“ کی تدوین اور اس کی استدلالی اشاعت کی تیسری وجہ تھی کہ اسی زمانہ میں ایک طرف یونان، ہند اور قدیم ایران کی فکری اور فلسفی روائی، میسیحی، بودھ، زرتشتی، مانوی اور مزدکی عقائدی روائی، راہبانہ اور صوفیانہ مسالک کی کشش، تو دوسری طرف یونانی فلسفیوں کے جهوریت (ڈیوکری)، نوافلاطونی اور ارسطوی مکاتب فردینیائے اسلام میں نفوذ کر رہے تھے۔ غیر مسلموں کی تحریروں کا ترجمہ اور کلامی بحث و مناظرے شروع ہو چکا تھا۔ اس طرح اس زمانے میں پیغامِ حق اسلام کے وجود کو سیاسی خطرہ سے زیادہ فکری، تہذیبی اور دوسرے نظاموں اور مسالک کی فکری و تہذیبی یلغار کا خطرہ تھا۔ اسی وجہ سے امام باقرؑ اور اس کے بعد امام صادقؑ، جو قوم کے حقیقی رہنماء اور اسلام کی عزت کے نگہبان تھے، نظریاتی محاورہ پر اسلام کی حمایت کی پر زور سعی کی۔

(د) اسی زمانہ میں برس اقتدار نظام ”درباری اسلام“ کی تدوین کی فکر میں تھا اور اسے ”حقیقی اسلام“ کے نام سے روشناس کر دینے کی فکر میں تھا، ایسا اسلام جو اموی اور عباسی خلفا کی خود سری کے لئے سازگار اور اس وقت کی ”موجودہ وضع“ کا محافظ ہو۔ حکومت سے وابستہ محدثین، فقہاء، خطباء اور متكلمین اس سلسلے میں شدت سے کوشاں کر رہے تھے۔ ہزاروں جعلی حدیثیں عام ہو چکی تھیں۔

اس بات کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اسلام کی انقلابی تعلیمات کو بدل نہ دیا جائے اور فراموش نہ کر دیا جائے، ان حالات میں حکومت سے سیاسی یا فوجی مقابلہ سے زیادہ ضروری تھا کہ حقیقی اسلام اور ”نظریاتی مقابلہ“ کی تدوین کی جائے۔

(ھ) پہلی بار اس زمانے کے سیاسی حالات نے اس قدر مہلت دی تھی کہ شیعہ نسبتاً آزاد افضل میں اپنے عقائد کے نقش کو واضح کر سکیں۔ اس زمانے میں بنی اسریٰ کی حکومت تباہی کی طرف جاری تھی۔ اسلامی مملکت کے اطراف و جوانب میں مسلح تحریکیں سراخہاری تھیں، اموی اقتدار و بزوال تھا اور عباسیوں کا استبداد ابھی بر سر اقتدار نہیں آیا تھا۔ دشمنان شیعہ آپس میں ایک دوسرے سے بر سر پیکار تھے۔ نتیجہ کے طور پر شیعوں کو اہل بیتؑ کی تہذیب کی تبلیغ اور ترویج کے لئے مناسب موقع مل گیا تھا۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر امام محمد باقرؑ کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو شیعہ نظریات کی تدوین اور اس کو استدلالی طریقے سے پیش کرنے اور فکری و تہذیبی بنیادوں کو مسحکم کرنے کا دور ہے۔ امام باقرؑ کے زمانے میں اس دور کا آغاز ہوا اور امام صادقؑ کے زمانے میں یہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

امام محمد باقرؑ کے زمانے کے حالات

امام محمد باقرؑ کے زمانے کے حالات سید سجادؑ کے گھٹن والے دور سے قدرے مختلف تھے۔ اب اموی حکومت کی زمام حجاج جیسے جلاド کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اس کے باوجود انہ کے لئے بہت ساری پابندیاں اور محدودیتیں تھیں۔ حالات غیر متوازن تھے۔ کبھی کسی خونخوار حاکم کے اختیارات بڑھ جانے سے حالات سنگین ہو جاتے تھے تو کبھی نرم مزاج خلیفہ کے بر سر اقتدار آنے سے حالات میں نسبتاً کچھ آزادی پیدا ہو جاتی تھی، جیسے عمر بن عبد العزیز کے دور میں امام کو نسبتاً آزادی حاصل تھی۔ اس وجہ سے کبھی امام کی زندگی کا کوئی رخ سید سجادؑ کی زندگی سے ملتا جلتا ہے تو کبھی کوئی رخ امام

جعفر صادقؑ کے زمانے سے مشاہدہ رکھتا ہے۔

پانچویں امام کا دور ۵۹ھ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ مقدار ترین اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کی خلافت کا آخری دور ہے۔ ۶۹ھ میں ولید کی موت ہوئی۔ اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بارہ سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد علی الترتیب عمر بن عبد العزیز، یزید بن عبد الملک اور هشام بن عبد الملک مسند خلافت پر قابض ہوئے۔

ولید بن عبد الملک نے اپنی خلافت کے آخری دور میں ہشام بن اسما عیل کو مدینہ کی گورنری سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ عمر بن عبد العزیز کو مقرر کیا۔ عمر بن عبد العزیز چوبیس سالہ جوان تھا اور ابتداء ہی سے دین کی طرف مائل تھا۔ اس وجہ سے اس نے مدینہ میں آتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ امام باقرؑ کے حضور میں حاضر ہوا اور تعلیم بجالا۔ اس طرح عمر بن عبد العزیز کے دور میں امام باقرؑ کو حاصل اسلام پھیلانے اور فضائل اہل بیتؑ کو متعارف کرانے کا مناسب موقع ملا۔

ولید بن عبد الملک کی موت کے بعد امویوں کی طاقتور حکومت زوال پذیر ہونے لگی۔ سلیمان بن عبد الملک جو ولید کا جانشین ہوا، عیاش تھا اور انتظامی لحاظ سے عبد الملک اور ولید کا ہم پلہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کے دور میں امور حکومت کی بنیاد میں نمایاں کمزوریاں واقع ہوئیں۔

سلیمان کے بعد عمر بن عبد العزیز نے دو سال پانچ ماہ حکومت کی۔ اموی خلفاء میں عمر بن عبد العزیز ہی وہ تھا خلیفہ تھا جس نے ظلم و ستم سے اجتناب کیا۔ اس کا جھکاؤ نسبتاً اسلام کی طرف تھا۔ اس نے امام، شیعوں اور علویوں سے متعلق سیاست میں نرمی بر قی اور منبر پر جناب امیرؑ کی شان میں نفرین جیسی مذموم حرکت کو موقوف کر دیا۔ اس وجہ سے اس دور میں امام باقرؑ کو معارف اسلامی کی ترویج کا مناسب موقع ملا۔

عمر بن عبد العزیز، جو اموی درباریوں کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا، اس کے بعد یزید بن عبد الملک بر سر اقتدار آیا۔ اس نے چار سال ایک ماہ حکومت کی، مگر وہ بھی زیادہ تر محل اور عیش و نوش

میں مشغول تھا اور بنی امیہ کے جلد زوال کا باعث بنا، یہاں تک کہ حکومت کی باغ ڈور ہشام بن عبد الملک کے ہاتھوں میں آئی۔

جب ہشام نے عنان حکومت سنہجاتی، اس وقت عراق اور اطراف میں مرکزی حکومت کا والی خالد القسری تھا۔ اس نے شیعوں کے لئے نسبتاً نرمی دکھائی مگر شیعیان علیؑ کے ساتھ اس کی نرمی کا حال جلد ہی حکومت پر کھل گیا۔ چنانچہ اسے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ یوسف بن عمر الشقی کو جو خون آشام اور جلاحدا کوں میں سے تھا، حاکم مقرر کیا گیا۔ چنانچہ پھر سرکوبی اور ظلم کی سیاست بحال ہو گئی۔ مشہور مورخ دینوری لکھا ہے: ”لَا يَدْعُ أَحَدًا يَعْرُفُ بِمَوَالَةِ بْنِ هَاشَمٍ وَمُوَدَّةِ أَهْلِ بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ الْأَبْعَثُ إِلَيْهِ مَجْسِيَّهُ عِنْدَهُ بِوَاسْطَهِ“^(۱) یعنی ”جو بھی بنی ہاشم سے کچھ تعلق رکھتا تھا قید میں ڈال دیا گیا۔“

امام محمد باقر اپنی زندگی میں اسی قسم کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے دو چار رہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ امام کے دور کے بعض حصے سید سجادؑ کے دور سے ملتے ہیں اور بعض حصے امام جعفر صادقؑ کے دور سے ممائش رکھتے ہیں۔

گھٹن کے دور میں امامؑ کی حکمت عملی

گھٹن کے دور میں امام باقر نے وہی روایہ اختیار کیا جو سید سجادؑ نے اختیار کیا تھا اور جدو جہد کا وہی اسلوب اپنا یا جو سید سجادؑ کا تھا۔ اس دور میں امام زیادہ تر روحانی رہنمائی اور افراد کی کردار سازی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے اہم کام ”پیغام“ کی حفاظت تھا۔ امام غنی اور نیم ظاہری طور پر شاگردوں کی تربیت میں مشغول رہے۔

بنی امیہ کے حکمران بھی ایک طرف تو شیعوں کا قتل عام کر رہے تھے مگر دوسری طرف جاز عراق، فارس اور تمام علاقوں کے لوگوں کے نزدیک ائمہ کی مقبولیت، اثر اور قدر و احترام کے پیش نظر

کربلا سے ملے ہوئے شکست کے تجربہ کے پیش نظر ان میں ائمہ کو اعلانیہ شہید کرنے کی جرأت نہیں تھی، اسی وجہ سے وہ زہر خواری پر اتر آئے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عوام میں اماموں کے اثرات سے خوفزدہ تھے۔

خود غرض اور ظالم اموی خلفاء اماموں کے علمی اور روحانی مقام سے واقف تھے، اکثر تاریخی واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ حساس اور ناڑک موقع پر وہ اپنی رہنمائی کے لئے اماموں کے محتاج ہوئے ہیں۔ ائمہ اہل بیتؑ نے بھی نظام خلافت کو کچلنے اور سوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ دربار خلیفہ میں بھی امام نے پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ کے فضائل کا اعلان کیا جس سے ابوسفیان وآل سفیان کی ندمت ہوتی ہے۔ اس نکتے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرہ کی رہبری امویوں نے غصب کی ہے پھر بھی اگر کسی معاملہ میں وہ دیکھتے تھے کہ اسلام کی عزت کا معاملہ ہے تو جناب امیر کی طرح اپنی رائے پیش کرنے اور رہنمائی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ”الحسان والمساوی“ (بیہقی، ج ۲ ص ۲۳۲) میں آیا ہے کہ جب خلیفہ نے غور کیا کہ قلمرو اسلامی میں چلنے والے رومی سکوں پر تقلیشی جملہ لکھا ہوتا ہے، تو اس نے حکم دیا کہ سکوں پر اس کے بجائے شعار تو حید لفظ کیا جائے۔ شہنشاہ روم نے خلیفہ کو دھمکی دی کہ اگر ایسا ہو تو وہ حکم دے گا کہ سکوں پر پیغمبرؐ کے لئے اہانت آمیز جملے لفظ کریں۔ خلیفہ عاجز ہو گیا، جب کوئی اسے اس نجنس سے نجات نہ دلا سکتا تو مجبوراً اس نے امام باقر کو مذہب سے بلوایا۔ چونکہ اسلام کا معاملہ درمیان میں آگیا تھا، اس لئے امامؑ نے خلیفہ کی رہنمائی کی کہ مسلمان کا ریگروں کو جمع کر کے اسلامی نکسال قائم کیا جائے جس میں اسلامی سکے ڈھالے جائیں۔ اس طرح اسلامی مملکت میں پہلی بار رومی سکے ترک کر دیئے گئے اور اسلامی سکے رانج ہوئے۔ غیروں کے مقابلے میں ہمارے ائمہ مسلمان معاشرہ کے تمام مصالح کو پیش نظر رکھتے تھے۔

مگر اسی حال میں امامؑ نے نظام ظلم پر حملہ، ظالم سے مقابلہ اور حاکموں سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ جب کہ حکومت کا عملہ امامؑ کی مصروفیتوں سے باخبر رہتا تھا۔ ایک بار عبد الملک جو بنی امیہ کا

قویٰ ترین خلیفہ تھا مدینہ گیا۔ حاکم مدینہ عمر بن عبد العزیز امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ”آپ ولید سے ملنے جائیں گے؟“ امام نے نفی میں جواب دیا۔ مگر پھر عمر بن عبد العزیز نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہیں جائیں گے، اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ امام ولید کو خلیفہ نہیں سمجھتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کا منفی مقابلہ اس قدر اعلانیہ ہوتا تھا جس کی حکومت کو خبر رہتی تھی۔

ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب امام محمد باقر سیاسی، ثقافتی اور فکری سرگرمیوں میں مشغول تھے، تو اس کو اموی خلفاء نے کس طرح برداشت کیا اور انہیں قتل یا قید کیوں نہیں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ولید کے بعد اموی حکومت کی حالت کافی سقیم تھی۔ دنیاۓ اسلام میں چاروں طرف تحریکیں اور بغاوتیں سراجھارہی تھیں اور ارباب حل و عقد ان شورشوں کو دبانے میں شب و روز مشغول تھے۔ دوسری بات یہ ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ کربلا میں کارنامہ حسینی اور زینب و سید سجادؑ کے افشاءٰ حقیقت کی وجہ سے یزید کے بعد اموی خلفاء کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اماموں سے براہ راست الجھنے یا انہیں قید کرنے سے گریز کریں۔ چنانچہ انہوں نے مناقفانہ طرز عمل اختیار کیا یعنی حقیقتاً وہ خواہ امام کے کتنے ہی شمن کیوں نہ ہوں بظاہر عوام کے سامنے ان کی بڑی عزت کرتے تھے، مثلاً جب ولید بن عبد الملک مدینہ آیا اور مسجد میں امام کو دیکھا تو سر و قد کھڑا ہو گیا اور امام کو اپنے رو برو بٹھایا، حالانکہ ان درونی طور پر ولید امام کا سخت شمن تھا مگر عوام کے سامنے امام سے اپنا لگاؤ ظاہر کرتا تھا اور یہ حسینؑ کی شہادت اور زینب و سید سجادؑ کی مظلومیت کا نتیجہ تھا جس نے دنیا کے قویٰ ترین انسان کو مظلومیت سے خوفزدہ کر دیا تھا۔

نسبتاً آزادی کے دور میں امام کی حکمت عملی

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ پانچویں امام کا دور اتار چڑھا کا دور تھا۔ شیعوں کی فکری اور تہذیبی سرگرمی کے لئے بھی کبھی اس قدر موقع عمل جاتا تھا کہ امام محمد باقر نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تدوین مکتب اور معارف اہل بیتؑ کو عام کرنے کا کام شروع کر دیا۔ (اسی کام کو امام صادقؑ نے کمل

کیا) اماموں کا ادراک عام ذی فہم حضرات جیسا نہ تھا بلکہ ”حکمت خداداد“ تھی اور یہ حضرات فیضان الہی کے سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے۔ مگر ہمارے لئے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ائمہ نے کن حالات میں کس قسم کی حکمت عملی اختیار کی، کیا کیا اقدامات کئے، کن حالات میں ”پیغام“ کو پھیلایا اور کن صورتوں میں پیغام کو نظام کی شکل میں ڈھالا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر جن کیوضاحت اس باب کے ابتدائی صفحات میں کی جا چکی ہے امام باقر نے محسوس کیا کہ نظریات کی تبلیغ کا صحیح وقت آپنہ چاہے۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے انہوں نے نظریات کی تبلیغ کی ابتدأ کر دی۔

امام باقر نے معارف عترت اطہار کو عام کرنے کی غرض سے ایک عظیم دانش گاہ کی بنیاد رکھی جہاں دنیاۓ اسلام کی علمی حلقہ سے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں متاز خصیتیں امام کے درس میں حاضر ہوتی تھیں اور اس معارف الہی کے سرچشمہ سے اکتاب فیض کرتی تھیں۔

اس خورشید امامت سے کسب فیض کرنے میں اسلام کے تمام فرقوں کے لوگ شامل ہیں اور اہل سنت کے جید علماء میں سے کچھ حضرات کو امام باقر کی شاگردی پر فخر ہے جن میں زہری، عطاب بن جرجج اور قاضی حفص بن غیاث کا نام لیا جا سکتا ہے۔

امام محمد باقر کے شاگردوں نے حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور معارف اسلامی کے تمام شعبوں کو علم و عرفان کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور ان میدانوں میں شیعی نقطہ نظر کو مدون کیا ہے۔ مثال کے طور پر ابان بن تغلب جو علم تراثات قرآن اور فقہ اللغوہ میں کیتائے زمانہ تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کی مشکل تعبیروں کی شرح کتابی صورت میں ”غراہب القرآن“ کے نام سے لکھی۔ ابو جعفر محمد بن حسن ابی سرح اور اسماعیل بن عبد الرحمن السودی جیسے افراد اپنے زمانے کے عظیم ترین مفسرین قرآن میں سے تھے اور مسلمانوں کے لئے علم تفسیر کے ارث تھا کی سمت را نما اور سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ جابر بن یزید جعفری اور یحییٰ بن قاسم ابو بصیر اسدی عظیم محدثین میں سے تھے۔ محمد بن مسلم نے امام باقر سے تیس ہزار حدیثیں نقل کی ہیں۔ علم الکلام میں عبد اللہ بن

میمون اور زرارہ بن اعین نے علم کلام کے شیعی نقطہ نظر کو مدون کیا۔ فقهہ میں عامر بن معاویہ ذہنی، سالم بن ابی حفصہ، ابو یونس کوفی اور یحییٰ بن قاسم ابو بصیر اسدی جیسے افراد نے شیعہ فقہی نظام کی تدوین کے سلسلے میں اہم قدم اٹھائے اور یہ سب کے سب امام محمد باقرؑ کی درس گاہ کے پروردہ تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام

”پیغام“ کو ”نظام“ میں ڈھانلنے والے

کہتبی انقلاب کی تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر تحریک کے تین مرحلے ہوا کرتے ہیں: ”پیغام“، ”اقدام“ اور ”نظام“۔ ہر تحریک ابتداء میں ایک پیغام کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقدام کے مرحلے سے گذرتی ہے اور آخر میں نظام کی صورت میں آجاتی ہے۔ تحریک جب تک پیغام اور اقدام کے مراحل میں رہتی ہے، اس وقت تک ”انقلاب مخالف“، ”قوتوں اور کفر و شرک“ جیسے خطرات میں گھری رہتی ہے یا بالفاظ دیگر اس میں حیات تو ہوتی ہے مگر استحکام نہیں ہوتا۔ طاغونی اور مخالف قوتیں ابتدائی مراحل ہی میں اس کا گلا گھوٹنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اور جب تحریک کی بنیاد مضبوط، گھری، فکری اور نظریاتی نہیں ہوتی تو طاغونی قوتیں ”گرمی“ کے ختم ہونے اور شعلوں کے سرد ہونے کی منتظر رہتی ہیں مگر جب پیغام اقدام کے ساتھ ہو اور اقدام ”نظام“ کی شکل اختیار کر لے تو پھر تحریک خطرہ سے خالی ہو جاتی ہے۔

تاریخ اسلام میں بھی اس بات کے کافی ثبوت ملتے ہیں۔ امویوں اور عباسیوں کے دور میں ”کیسانیہ“ (پیروان محمد حفظہ) اور زیدیہ تحریکیں طاقتور ترین انقلابی تحریکیں سمجھی گئی ہیں۔ چونکہ یہ تحریکیں ”عمل زدگی“، یعنی عمل کی مار اور کارروائی کی ٹوٹن کا شکار ہو گئیں، اقدام نے پیغام کو دبالیا، اور پیغام نظام کی صورت میں نہ آسکا (تجربہ کا شکار ہو گئیں)۔ اسی لئے اموی اور عباسی طاقتوں نے اس تحریک کو صفحہ روزگار سے محکر دیا۔

زیدیہ تحریک کی حکمت عملی ”عمل زدگی“ کی سمت اخراج کا شکار ہو گئی اور پیغام کو نظام کی صورت میں ترتیب دینے کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت زید اور ان کے

فرزند بیگنی جنہوں نے اپنی تحریک سے حکومت کو لرزہ براند ام کر دیا تھا، ان کے زور و شور والے کارنامے طاق نسیان کی نذر ہو گئے۔ چونکہ زیدیہ تحریک کو نظریاتی پشت پناہی اور مستقل فکری بنیاد حاصل نہیں تھی، اس لئے رفتہ رفتہ دوسرے فرقوں میں جذب ہو کر ختم ہو گئی۔ اسلامیہ تحریک بھی اسی مقدار سے دوچار ہوئی۔ اسلامیہ فرقہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں ہجری میں اس قدر قوی تھا کہ اس نے خلافت میں ایک دھماکہ جیسی کیفیت پیدا کر دی تھی، الموت، طس اور بیرچنڈ کے عوام میں اس کے عقائد و نظریات اس قدر مقبول تھے کہ ان علاقوں میں اس فرقہ نے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دئے اور سلبوقیوں کی خلافت اور ان کے انتدار کو بے دست پا کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر وہ بھی چونکہ پیغام کو نظام کی منزل تک نہ پہنچا سکے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریک بھی جودو اخراج کا شکار ہو کر رہ گئی۔

مگر شیعہ ائمہ کی خداداد حکمت عملی کی بنیاد یہ رہی ہے کہ پیغام کو اقدام کا جڑوال بنانے اسے نظام کی شکل میں لے آیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ ہمیشہ اپنے شخص، اپنے مذہب کی خصوصیت اور اسلامی انقلاب کی مہہیت کی حفاظت کرنے کے قابل رہے۔

ائمه عترت علیہم السلام کی حکمت عملی کا مکمل مقصد اسلام کی حفاظت، مکتب کا دفاع اور اسلام دشمنوں سے مستقل نبرد آزمائی تھا۔ انہوں نے وقت کی ضرورت اور حالات کے لحاظ سے مختلف عنوان کے طریقہ کاراپناۓ۔ کبھی مسلحانہ تحریک، کبھی گھری فکری جنگ اور علوم و معارف اسلامی کی اشاعت سے اور کبھی دعاویں کے ذریعہ پیغام رسانی کے اعظیم فریضہ کو نجام دیا ہے۔

شیعہ قیادت کبھی بھی اصول کو پچھے کرنے اور عمل کی مار کا شکار نہ ہوئی۔ کیسانیہ اور زیدیہ تحریکوں کے برخلاف سیاست پر نظر نہیں رکھی بلکہ ساری توجہ اصول و نظریات پر مرکوز رکھی۔

ہمارے ائمہ نے ہمیشہ اقدام کو پیغام کے ساتھ رکھا اور اس کے بعد نظام کی صورت میں پیغام کی ضرورت پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ہماری تاریخ میں (فکری کادشوں جیسے) نجح البلاغہ ہمیشہ آگے رہا اور صحنیں اور جمل جیسی کوششیں پیچھے رہی ہیں۔ ہمیشہ سر حسین، زینب اور سید سجاد کی

پشت پناہی رہی۔ زینب اور امام سید سجادؑ نے پیغام کو منتقل کیا اور اس کے بعد امام محمد باقر اور امام جعفر صادقؑ نے پیغام کو نظام کی منزل تک پہنچایا۔

امام جعفر صادقؑ اس تیسرے مرحلہ یعنی نظام کی صورت میں پیغام کی تدوین کے مرحلہ کے عظیم مظہر ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اس واحد خدائی حکمت عملی کو مکمل کرنے والے ہیں جو آدمؑ سے شروع ہوئی اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیؑ اور ان کی اولاد کے ذریعہ جس کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اسلام کے اس مورچے کی دفاعی حکمت عملی کا یہ عالم ہے کہ کربلا میں حسینؑ نے اپنا خون بہا کر یزید کو شکست دی۔ امام جعفر صادقؑ نے مکتب کی تدوین کی حکمت عملی سے ہشام اور منصور کی قوت کو ناکارہ کر دیا اور امامت کے مقدس مقصد کو صحیح تعلیمات اسلام کی تدوین کے ذریعہ نظام کی صورت میں لا کر مستحکم کر دیا۔ اس کے بعد شیعہ تحریک ایسی بے خوف و خطر ہو گئی کہ بدترین حالات ظلم و ستم، جبس، درباری نظام کے حملوں اور وابستہ عناصر کے باوجود شیعہ تحریک دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی اور تاریخ میں سچے اسلامی انقلاب کا جھنڈا الہ اکر رہا۔

امام صادقؑ کے بارے میں دو طرز فکر موجود ہیں۔ ایک طرز فکر جو راجح ہو گیا ہے اور مغربی دانشوروں نے بھی اس کے رواج میں کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ یہ طرز فکر امام جعفر صادقؑ کو ایک ایسے عظیم مفکر کے عنوان سے روشناس کرتا ہے جو خود کو سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلک رکھ کر درس و تدریس اور شاگردوں کی تربیت میں مشغول رکھتے ہیں۔ یہ طرز فکر امام کو زیادہ سے زیادہ ”فقہ عجفری“ کے تدوین کنندہ کی حد تک پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے۔ اس کے راجح کرنے والے وہ ہیں جو سماجی اور سیاسی مجاہدہ کے فرائض سے خود کو اور معاشرے کو متاثر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلے برسوں میں اس فکر کے مقابلے میں بعض انقلابی یا انقلاب نما عناصر کی طرف سے ایک دوسرے طرز فکر پیش ہوا۔ اس کی بنیاد بھی ایک اخراج آمیز طرز فکر پر ہے۔ ان تجزیات میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ امام صادقؑ کو ایسی نبرد آزمائی کی حیثیت سے پیش کیا جائے جس کا مقصد ہمیشہ ایک سیاسی انقلاب کی تیاری تھا۔

یہ طرز فکر بھی ایک انحرافی خیال پر مبنی ہے اور یہ امام کے ان کاموں کی قدر کو گھٹا دینا ہے جن کی بنیاد نظریاتی ہے یا جو تدوین مکتب اور ذمہ دار مومنین بنانے سے متعلق ہے۔ یہ گروہ معدرات خواہانہ لجئے میں ان تاریخی شواہد کی تاویل اور تو جیہہ کرتا ہے یا یکسر نظر انداز کر دیتا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام نے اپنی پیشتر توجہ معارف اسلامی کے پھیلانے پر مبذول کر رکھی تھی۔

انہ کی زندگی کے مطالعہ کے سلسلے میں صحیح اصول یہ ہے کہ انہیں ہوئے ہوئے ویسا ہی پیش کیا جائے جسے وہ تھے۔ ان کی پیروی اور اپنی فکری اور عملی زندگی کو ان کی سیرت کے سانچے میں ڈھانے کی کوشش کی جائے نہ کہ ان کو ویسا پیش کیا جائے جیسا ہم پیش کرنا چاہیں اور ان کی سیرت کو اپنے حسب مشناطا ہر کریں۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امام جعفر صادق نے امامت کی خدائی بصیرت کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ اس زمانے میں ان کی عظیم تر ذمہ داری تدوین مکتب، شیعی عقائد کی بنیادوں کو مستلزم کرنا، معارف اسلامی اور الہی نظریہ کو پھیلانا ہے۔ انہ کا کام محض ایک ”فضل اسلامیات“، محقق اور دانشور کا کام نہیں ہے بلکہ ایک خدائی رہبر کے فرائض اور اسلامی انقلابی تحریک کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہے۔ نگاہ امامت نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ ان کی اصل ذمہ داری ”فرد سازی“، معاشرہ سازی، تدوین مکتب اور انقلابی عناسی کی پرورش ہے۔

امام نے تاریخی اجتماعی اور سیاسی ضرورت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ اس زمانے کے کیسانیہ اور زیدیہ فرقوں کی طرح بغیر سوچ سمجھے مقابلہ کرنے کے بجائے نظریاتی جنگ اور مکتب اسلام کی ترتیب و تدوین اور عوام میں اس کی تبلیغ زیادہ ضروری ہے تا کہ دربار اور حکومت کی تبلیغ کرنے والے اہل بیتؑ کی تعلیمات کو صفحہ بھستی سے مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

امام نے اس دور کو شیعہ مسلمک کی تبلیغ اور نظریات کی تدوین کے معروکے کے لئے کیوں مناسب سمجھا؟

سیاسی نکتہ نظر سے امام جعفر صادق کا دور امویوں اور عباسیوں کے بیچ سخت سیاسی

رقابت، سرمایہ دارانہ جنگ اور اقتدار کی شکماش کا دور تھا۔ ایک طرف اموی دور حکومت کا زوال ہو رہا تھا، دوسری طرف عباسی اقتدار بڑھ رہا تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ دونوں دیوبیکر قوتوں میں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگا رہی تھیں۔ اس طرح مدینہ میں جو یہ مختصر شہر ا موقع ہاتھ آ گیا تھا اگر وہ ضائع ہو جاتا تو شاید دوبارہ ایسا موقع ہاتھ نہ آتا۔ یہ حالات امام محمد باقرؑ کے دور سے شروع ہوئے اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں پاپیہ تکمیل کو پہنچے۔ اسی وجہ سے امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے اس غیر معمولی نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاگردوں کی تربیت اور معارف اسلام کی تبلیغ کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ امام صادقؑ نے اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی کہ ان کا ہر شاگرد معارف اسلامی کے کسی نہ کسی شاخ کا رکن رکین اور انسانی علوم و آگئی کا بانی بن گیا۔

تہذیبی حالات کے علاوہ اس دور کا ایک عظیم تقاضا یہ تھا کہ اسلام کی صحیح شکل و صورت کی حفاظت کے لئے تدوین مکتب کا کام انجام دیا جائے۔

امام جعفر صادقؑ کا دور عالم اسلام میں رخنہ اندازی کا دور دورہ تھا اور غیر اسلامی افکار و نظریات کے نفوذ کا دور تھا۔ یونانی افکار، بودھ خیال، مسیحی، مزدکی اور الحادی نظریات اسلامی دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ ”شرق زدہ“ اور ”مغرب زدہ“ افراد مسلمانوں کو کھلم کھلا دعوت مناظرہ دے رہے تھے اور اسلام سے مقابلہ پر اتر آئے تھے۔ ان غیر اسلامی افکار کے پھیلنے کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:-

(الف) دنیا کے اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کی توسعہ کی وجہ سے اسکندریہ، ہرات اور گندیشہ پور جیسے اسلامی افکار کے مرکز عالم اسلام میں شامل ہو گئے تھے اور غیر اسلامی مفکریں دنیا کے اسلام کو پر اگنہ کر رہے تھے۔

(ب) صاحبان اقتدار کی ہمت افزائی اور سرپرستی نے جو معاشرے کی توجہ اصلاحی مسائل اجتماعی و سیاسی و دینی درد کی طرف سے ہٹا کر فروعی مسائل کی طرف مبذول کر کے غیر اسلامی فلسفی اور کلامی

افکار کو تقویت دی تھی۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ اسلام کے اصلی نظریات کی روشنی میں متعلق فقہ، کلام اور فلسفہ وغیرہ سے متعلق مسائل کو مدون کیا جائے تاکہ معاشرہ فکری جیرانی اور مذہبی آوارگی سے دوچار نہ ہونے پائے۔

اسی دور میں حکمران طبقے نے بعض وابستہ عناصر کو پنا آہ کار بنالیا تھا تاکہ وہ حالات کے مطابق نظام اسلام کی رسمی تفسیر کریں، اس طرح حقائق اسلامی کی غلط تفاسیر اور اسلام کے اصل چہرہ کے مسخ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے پانچویں اور چھٹے امام نے تدوین مکتب کے کام کو اپنی سرگرمی کا محور بنایا۔

مگر امام جعفر صادق اسی حالت میں جب وہ اپنی تمام تر توجہ ”فرد سازی“، ”امت سازی“ اور دین و مکتب کی اشاعت پر مرکوز کئے ہوئے تھے، سیاسی و اجتماعی معركہ آرائی اور انقلابی سرگرمیوں سے بھی غافل نہ تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ امام جعفر صادق کی اولاد میں کچھ نے مسلح قیام کی ابتداء کی اور ایسے زبردست انقلاب برپا کئے کہ ان مختصر اور اراق میں ان کا تفصیلی بیان ممکن نہیں ہے۔

امام جعفر صادق کے عظیم کارنامے

امام جعفر صادق نے شیعیت کو خطرات سے محفوظ کیا اور اسلام کی اصل تعلیمات کو اس حد تک پھیلا دیا کہ صاحبان زر و ہوس اور اپنے زمانے کے بلعم باعوروں، قارنوں اور فرعونوں کے لئے اسلام کی صورت مسخ کرنا یا اسلام کو اصلی شکل کی جگہ کسی دوسری تقلی صورت میں اتنا ناممکن ہو گیا۔ اس عظیم کارنامہ میں امام جعفر صادق کی کاؤشوں کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ شیعہ مذہب کو ”مذہب جعفری“ کہا جائے گا۔ امام باقر کے زمانے تک شیعیت پیغام کی حالت میں تھی امام جعفر صادق نے اسے نظام کی منزل تک پہنچایا۔

امام جعفر صادق نے اپنی نظریات کو چار ہبھتین طریقوں سے پیش کیا:-

(۱) شاگردوں کی تربیت

(۲) پیغمبر اور ائمہ سلف کی احادیث کی روایت

(۳) شیعہ فقیہی نظام کی تدوین

(۴) شیعوں کے اعتقادی اور کلامی روشن کروشن کرنا

علمی و فکری میدان میں امام جعفر صادق کے کارہائے نمایاں اس تدریغی تبلیغت اور اہمیت کے حامل ہیں کہ اسلام اور تمام دنیا کے صفات کے مفکرین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ) نے، جو تاریخ اسلام میں متاز ترین دانشور شمار کیا جاتا ہے، کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد امام جعفر صادق سے بڑا دانشور اسلام میں پیدائیں ہوا۔

امام جعفر صادق صرف شیعیت ہی کو ”نظام“ کی صورت میں نہیں لائے بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں فقہ کی تدوین کی کیونکہ سنیوں کے چاروں امام جو چار فقہوں کے بانی ہیں، بالواسطہ یا بیان واسطہ امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ ابوحنیفہ جو اہل سنت میں فقہ کے سب سے پہلے تدوین کننده ہیں امام جعفر صادق کے شاگردوں میں تھے۔ دو سال خدمت امامؐ سے استفادہ کرتے رہے اور وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ: ”لولا سitan لهلک النعمان“^(۱) یعنی ”اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان (ابوحنیفہ) ہلاک ہو جاتا۔“

ہمارے ائمہ خورشید جہاں تاب تھے جن کی بارگاہ سے اسلام کے تمام فرقوں حتیٰ کہ غیر مسلموں تک نے استفادہ کیا ہے۔ امام کے درس میں صرف اہل سنت کے فقہی و کلامی مکاتب کے بانی ہی نہیں بلکہ نصاریٰ اور صائبین کے دانشور تک حاضر ہوئے تھے۔ شیخ ابو الحسن خرقانی کہتے ہیں:-

”مسلمان اور کافر سب بارگاہ امام جعفر صادق میں حاضر رہا کرتے تھے اور ان کے خوان

(۱) یہ جملہ المتن کے برگزیدہ عالم عبدالحق نے شیعوں کی رد میں کہی جانے والی ”تحفہ الشاعریہ“ میں نقل کیا ہے۔

فضل سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔“

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:-

”جب ہم مسلمان قوم کی تاریخ میں امام جعفر صادق کے دور کا ان کے پہلے کے دور سے مقابلہ کرتے ہیں تو بالکل نور اور ظلمت کا مقابلہ معلوم ہوتا ہے۔“^(۱)

امام جعفر صادق کی بارگاہ درس میں صرف ”منقولات“ ہی کی تدریس نہیں ہوتی تھی بلکہ ”تجرباتی علوم“ اور فلسفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ چھٹے امام نے صرف فقہ کی تدوین یا تفسیر و حدیث اور کلام ہی کو وسعت نہیں دی بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علوم طبیعی (Natural Sciences)، بیت (Astronomy) اور طبیعت (Physics) کو بھی وسیع پیانا پر مرتب کیا۔ امام جعفر صادق سے پہلے امام محمد باقر نے بھی طبیعت اور جغرافیہ کا درس دیا تھا مگر امام جعفر صادق نے ان علوم کو وسعت دی۔ اسٹریٹس برگ کی تحقیقاتی درس گاہ کے دانشور جو یورپ کے مشہور ماہرین اسلامیات ہیں اس نتیجہ پر پہنچ ہیں کہ کو پنکس کا زمین کے گرد سورج کی گردش کا نظریہ جو قرون آخر کے سائنسی مسلمات میں سمجھا جاتا ہے، اس سے ہزار سال قبل امام جعفر صادق نے سورج کے گرد زمین کی گردش کا اعلان کیا تھا جس سے پہلے کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ پہلی بار امام جعفر صادق نے یہ اعلان کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ دن اور رات اسی روزانہ کی گردش کا نتیجہ ہیں۔ یورپی مفکر لکھتا ہے کہ: ”ان حالات میں صرف ہی ان حقائق کا سراغ پاسکتا تھا جو غیر معمولی عقل کا مالک ہوا اور ہی بغیر کسی وسیلہ کے ایک ایسی حقیقت تک پہنچ سکتا تھا جس کا اظہار اس کے پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔“^(۲)

وہ مغربی مفکر یہ کیا جانے کہ امام جعفر صادق کی ہستی وہ ہے جس کا براہ راست رابط آسمانی علم کے سرچشمہ سے ہے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو دی، الہام، علم وہی اور انہیاء اور انہمہ کی خصوصی

(۱) مغرب متفکر جہان شیعہ، مرکز تحقیقاتی اسٹریٹس برگ، ص ۶۰ و ۶۹

(۲) مغرب متفکر جہان شیعہ، ص ۹۵

قوتوں اور کرامتوں کا معتقد نہ ہو، اس امر کی توجیہ مشکل ہے کہ کپل اور کوپنگل کے نظریات پیش کرنے کے کم و بیش ہزار سال قبل امام جعفر صادق نے یہ کس طرح بتا دیا کہ زمین گول ہے اور وہ آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے، وہ بھی ایسی صورت میں کہ اس دور کے قسطنطینیہ، اسکندریہ، انطا کیہ اور گندیشا پور جیسے علیٰ مراکز سے مدینہ دور تھا۔ انہمہ اور انہیاء اختیارات کے مالک کامل انسان ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تمام حقائق کو براہ راست بغیر کسی درمیانی پر دہ کے دیکھ لیتے ہیں۔

وچی، الہام، اشرار، تعلق اور حسی تجربہ یہ سب کسب معرفت اور کشف حقیقت کے مختلف وسائل ہیں، مگر وہی اور الہام کے ذریعہ جو حقائق روشن ہوتے ہیں وہ پہنچتے ہوتے ہیں جبکہ تعلق و تجربہ کے وسیلہ سے حاصل ہونے والے حقائق ناقص اور رفتہ رفتہ حاصل ہوتے ہیں۔

اسٹریٹس برگ کی درس گاہ کے دانشور اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ تاریخ انسانی میں امام جعفر صادق نے پہلی بار اس طبو کے طبیعتی نظریہ کے خلاف یہ بتایا تھا کہ مٹی اور ہوا خالص عناصر نہیں بلکہ دوسرے عناصر سے مرکب ہیں۔ اس زمانے بلکہ اس سے بھی سینکڑوں سال بعد تک عناصر اربع علم الالاشیاء کے ارکان میں سے سمجھے جاتے تھے، بقول ایک یوروپی محقق کے: ”امام جعفر صادق نے اٹھاروں یہ صدی عیسوی کے علماء سے گیارہ سو برس قبل ہوا کے اجزاء کا انشاف کیا اور بتایا کہ ہوا تہماں ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اور کئی عناصر کا مرکب ہے، اس طبو کے بعد تک کے دنیاۓ طبیعت کے متاز ماہرین یہ نہیں جانتے تھے کہ ہوا کوئی عنصر (Element) نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اٹھاروں یہ صدی عیسوی میں لاوازیہ کے دور تک اکثر دانشور ہوا کو ایک عنصر سمجھتے تھے۔ جب لاوازیہ نے ہوا میں موجود دیگر گیوں سے آسیجن کو الگ کیا اور ثابت کیا کہ آسیجن سائنس میں اور جلانے میں بہت بڑا اثر رکھتی ہے تو اس کے بعد سائنس دانوں کی اکثریت نے اس بات کو مانا کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے بلکہ چند گیوں کا مرکب ہے، اس طرح امام جعفر صادق اپنے وقت سے گیارہ سو برس آگے تھے۔“^(۱)

(۱) مغرب متفکر جہان شیعہ، ص ۶۰ و ۶۹

امام جعفر صادقؑ نے نہ صرف یہ اکشاف کیا کہ ہوا چند عناصر کا مرکب ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ ہوا میں موجود عناصر نفس کے لئے ضروری ہیں۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں لاوازیہ کے آسیجن کے اکشاف کے بعد بھی ہوا میں موجود دیگر گیسوس کو ہوا کے اعتبار سے بے فائدہ سمجھتے رہے اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں انہوں نے اپنے نظریہ کی اصلاح کی اور اس نکتہ پر متفق ہوئے کہ ہوا میں موجود دیگر گیسیں اگر آسیجن کے ساتھ شامل نہ ہوتے تو تمام ذی روح کا پھیپھڑا جل جاتا اور ان کا وجود ختم ہو جاتا۔ لہذا آسیجن کے ساتھ ہوا میں موجود دیگر گیسوس کی شمولیت بھی حیات کا لازمہ ہے۔ اس طرح بارہ سو برس بعد دنیاۓ علم نے امام جعفر صادقؑ کے قول کی تصدیق کی کہ ہوا میں موجود تمام گیس تنس کے لئے ضروری ہیں۔^(۱)

اسی طرح چھٹے امام نے فرمایا کہ: ”ہم لو ہے کوئی کڑی کی طرح جلا سکتے ہیں۔“ آج ہم دیکھتے کہ لو ہے کو اگر اس طرح گرم کیا جائے کہ وہ سرخ ہو جائے، اس کے بعد اسے خالص آسیجن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں آگ لگ جاتی ہے، ایسا چراغ بن سکتا ہے جس کا فلیتہ لو ہے کا ہو۔ بہر حال لاوازیہ تک اس نکتہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا مگر امام جعفر صادقؑ نے لاوازیہ اور پریسٹلی سے بھی بہتر آسیجن کے خواص کو ان سے بہت پہلے بتا دیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ اہل بیتؑ جو علم وہی کے چشمہ لا یزال سے سیراب ہوتے رہے ہیں نہ صرف انہوں نے مذہبی معنوی اور روحانی علوم پھیلائے ہیں بلکہ علم طبیقی، جغرافیہ اور دیگر علوم میں انسانیت کے لئے افق کھول دیے۔ عمل اسلام کی بصیرت اور جہاں بینی، کامظہر ہے، جو دین کو دنیا سے اور روح کو مادہ سے جدا اور بے ربط نہیں سمجھتا اور ”دین“، ”دانش“، ”علم“، ”ذہب“، ”الہام“، ”عقل“ اور ”تجربہ“ کے درمیان تضاد کا قائل نہیں ہے۔ ائمہ نے اپنے عمل کے ذریعہ اپنے پیروں پر یہ ظاہر کر دیا کہ صرف علوم مذہبی میں ہی نہیں بلکہ طبیقی اور انسانی دانش کی قلمرو میں بھی تمام ملتوں اور قوموں کے آگے آگے چلنا چاہئے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر میدان میں

انسانیت کے لئے ”لیڈر“ اور نمونہ بن کر رہیں، اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں ”شہداء علی النّاس“ لیتی انسانوں پر گواہ بنا کر پیدا کیا ہے اور ”شہد“ وہ ہوتا ہے جو ممتاز حیثیت کا مالک ہو، چنانچہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر میدان میں یہاں تک کہ ٹیکنا لوجی تک میں تمام قوموں میں ممتاز رہیں۔

شیعہ ائمہ متعدد جہات کے مالک تھے۔ وہ بے عیب انسان کامل تھے۔ ایک طرف تو وہ فکری کمالات کے مالک تھے اور دوسری طرف اخلاقی اور عملی کمالات کے ساتھ ربانی روحانی مدارج کے حامل بھی تھے۔ امام جعفر صادقؑ کو صرف شیعہ ہی خدائی رہبر اور معمصون نہیں مانتے ہیں بلکہ تمام غیر شیعہ مسلمان بھی روحانی مقامات کی حیثیت سے انہیں دنیا کے عرف کا پیشوامانے تھے ہیں۔ تمام عرف کا سلسلہ امیر المؤمنینؑ پر ختم ہوتا ہے اور امام جعفر صادقؑ بھی جیسا کہ عرفاء کے اقطاب نے اقرار کیا ہے، مثلاً شیخ عطار نے ”تذكرة الاولیاء“ میں زختری نے ”ریح الابرار“ میں اور ابو الحسن خرقانی نے بھی اس کا اقرار کیا ہے کہ آپ دنیا کے عرفاء کے پیشوام تھے۔

مگر وہ عرفان جس کے پیشواعہمارے امام تھے، وہ صوفیوں کے انحطاط پذیر عرفان سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارے ائمہ حقیقی اسلامی عرفان کے مظہر تھے۔ ایسا عرفان جو معاشرہ سے گریز اور وحدت الوجود کے متعلق نظریاتی تانہ بانہ بننے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایسا عرفان ہے جس کی بنیاد توجیہ اسلامی اور وحدت پر ہے۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام

ظلم و جور سے معرکہ کے علمبردار

آسمان ولایت کے ساتویں خورشید حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اکثر مورخوں کے قول کے مطابق، ۷ رصفر ۲۸ ھجری میں پیدا ہوئے۔ امام موسیٰ کاظمؑ امام جعفر صادقؑ کے تیسرا فرزند تھے۔ آپ کی والدہ مکرمہ بربر قوم کی ایک پرہیزگار خاتون تھیں۔ ساتویں امام کی امامت کا زمانہ خلافت منصور کا آخری دور تھا۔ آپ کا دور منصور کے بعد مہدی اور ہادی کے دور سے ہوتا ہوا ہارون الرشید کی خلافت کے تیرہ سال تک رہا۔

عباسیوں کو اگرچہ (ابو عباس) سفاح نے اقتدار تک پہنچایا مگر خلافت عباسیہ کا اصلی بانی منصور تھا۔ اس نے چالاکی، سیاست بازی اور خوب آشامی کے ذریعہ عباسی اقتدار کو مستحکم کیا۔ منصور کے دور اقتدار میں زیادہ تر سادات اور علوی جو حکومت حق کے قیام کے لئے کھڑے تھے یا جو ائمہ اہل بیتؑ کے زیر اثر تھے شہید کر دئے گئے۔ البتہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں خود منصور شہر بغداد کو جدید پایہ تخت بنانے میں سرگرم تھا، اسی وجہ سے امام موسیٰ کاظمؑ علیہ و تہذیبی سرگرمیوں کا موقع مل گیا جس کی ابتداء امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کرنے تھے۔ اس دور میں شیعوں اور تنام مسلمانوں کی علمی، فکری اور تہذیبی رہنمائی کا کام امام موسیٰ کاظمؑ کے ذمہ تھا کیونکہ ہر سیاسی اور انقلابی تحریک کے لئے پہلے نظریاتی اور فکری تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ دو شیعوں کے عقائدی پر اکنڈی کا بھی دور تھا۔ پہلے سے موجود کیسانی اور زیدی فرقوں کے علاوہ اب فرقہ امام علی اور عبد اللہ فتح کے پیروکؤں کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے بہت زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ شیعوں کے بنیادی عقائد اور نظریات کی واضح تشریح اور توجیہ پیش کی

جائیں۔ اس طرح امام موسیٰ کاظمؑ کے ابتدائی دس برسوں کو نظریات کی وضاحت کا وہ دور سمجھنا چاہئے، جس کی ابتداء امام محمد باقرؑ کے دور سے ہوئی اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں جاری رہی۔ ائمہ کے مقابلے میں حکومت کے روایہ کے لحاظ سے اور امام کے کارناموں کے پیش نظر امام موسیٰ بن جعفرؑ کے دور کو منتقلی کا دور شمار کرنا چاہئے۔ شیعوں کو نسبتاً آزادی کا جو دور م Hispan امویوں اور عباسیوں کی باہمی کشکش کی وجہ سے مل گیا تھا وہ امام محمد باقرؑ کے زمانہ سے شروع ہو کر امام صادقؑ کے زمانہ سے ہوتا ہوا امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ کے دس سال تک قائم رہا۔ اس دور ان ائمہ نے شیعہ تہذیب کی ترویج کا کام کیا۔ اس کے بعد سے ظلم و استبداد اور سرکوبی کا دور شروع ہوا جس سے امام کاظمؑ، امام جوادؑ اور امام حسن عسکریؑ دوچار ہے۔ (امام رضاؑ کا دور ایک خاص خصوصیت کا حامل اور ایک مستثنیٰ دور سمجھا جاتا ہے)

نقوش کار کے لحاظ سے بھی امام موسیٰ بن جعفرؑ کا دور علمی فعالیت ”تدوین نظام“ نشورو اشاعت اور آگاہی سے سیاسی معرکہ کی طرف منتقلی کا دور ہے۔ تدوین ”نظام“ کے مرحلے کے بعد پھر اقدام کا مرحلہ آجاتا ہے اور شواہد بتاتے ہیں کہ امام کاظمؑ اس کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔ منصور کے بعد یکے بعد دیگرے مہدی، ہادی اور ہارون برسر اقتدار ہوئے۔ یہ زمانہ حقیقتاً خلافت عباسیہ کے اقتدار اور شیعوں اور علویوں کی سرکوبی اور ان پر ظلم و تشدد کے عروج کا تھا۔ اس دور میں بہت سی شیعی تحریکیں شروع ہوئیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ فرقی اور علمی فعالیت کے بعد سیاسی اقدامات کی تیاری فرمار ہے تھے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی اور مفہوم و ابعاد امامت

شیعی نکتہ نظر سے امام یا انسان کامل ایسی ہستی ہوتا ہے جس نے خلیفہ الہی کے تمام روحانی، اخلاقی اور علمی صلاحیتوں کو روکا ری بخشی ہے اور اس مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے کہ خلق کے لئے نمونہ اور ہبہ اور فیض ربانی کا ذریعہ ہو۔ امام صفات عالیہ اور مقامات معنوی میں بہترین خلاائق اور

سیاسی، اجتماعی اور فکری میدان میں ان کا رہبر اور پیشواد ہوتا ہے۔ وہ روح اسلام سے خمیر ہوتے ہیں اور اوپر کے سرچشمہ سے رابطہ رکھتے ہیں، عملًا لوہی نظام اسلام کے اجر اکرنے والے ہوتے ہیں۔ امام مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کے حامل ہوتے ہیں:

(۱) سیاسی اور غیر سیاسی لحاظ سے عام رہبری

(۲) گفتار و فتاویٰ سے علوم و معارف اسلامی کی تشتیج، اشاعت اور عملی پیشکش اور دین کی حفاظت

(۳) روحانی کردار، امامت باطنی اور معاشرے کی روحانی اور اخلاقی پروش

شیعوں کے ساتویں پیشواد امام موسیٰ بن جعفرؑ بھی مندرجہ بالا اصولوں اور خصائص کا مجسم تھے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم امامت کے جہات اور مفاہیم کو نہ صرف فکری و تحریدی نقشی لحاظ سے بلکہ امام کی حیات طیبہ میں، ان کی جنتی جاگتی عملی پیکر کی صورت میں ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

امام کا وہی علم

امام کی خصوصیات میں ایک خصوصیت، وہی علم ہے یعنی پیدائش کے وقت ہی سے امام خاص بلکہ، خاص صلاحیتوں کا اور ”علم حضوری“ کا مالک ہوتا ہے۔ مدرسہ، مكتب اور اکتسابی علم کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ ایک معصوم دوسرے معصوم سے اور اپنے پیشواد سے رموز علم و حکمت رباني اور باطنی بلند یا حاصل نہیں کرتا، جیسا کہ ائمہ نے مکر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے مگر انہیں حالات میں امام فیضان الہی کے سرچشمہ سے براہ راست بھی سیراب ہوتا ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ بھی اس مفہوم کا عملی پیکر تھے۔ تاریخ و سیر کی کتابیں بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ جب کم سن تھے اس وقت اہل سنت کے حنفی مسک کے پیشواد ابوحنیفہ سے ان کی گفتگو اور مناظرہ اس حقیقت کا ایک منہ بولتا گواہ ہے۔ سیرت نویسوں میں سے اکثر نے اس مناظرہ کو ابوحنیفہ کے قول سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”سفر حجج کے موقع پر بعض اختلافی مسائل پر امام جعفر صادقؑ سے گفتگو کی غرض سے اور ان سے ملنے کے لئے مدینہ پہنچا۔ ملاقات کی اجازت

کے انتظار میں دلیز پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بچہ باہر آیا جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر کوئی مسافر رفع حاجت کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو کیا کرے؟ بچہ نے ایسا مفصل اور مدلل جواب دیا اور اس سلسلے میں اتنے واجبات، مستحبات اور نکروہات گنوائے کہ میں شرمندہ ہو گیا۔“

اس کے بعد حنفی مسک کے امام ابوحنیفہ نے ایک پیچیدہ سوال کیا: ”گناہ کا سرچشمہ کیا ہے؟“ موسیٰ بن جعفرؑ نے جواب دیا: ”گناہ کا سرچشمہ یا خالق کی ذات ہو سکتی ہے یا مخلوق کا عمل یا دونوں کا اشتراک۔ اگر گناہ کا سرچشمہ خالق ہوتا تو اس کے لئے وہ بندوں کو سزا نہ دیتا۔ اگر گناہ کا سرچشمہ خالق و مخلوق کا مشترک کہ ارادہ ہوتا تو بھی خالق کی ذمہ داری زیادہ تھی کیونکہ وہ زیادہ طاقت اور ارادے کا مالک ہے لہذا قوی تر ہو کر وہ ضعیف تر کو سزا نہ دیتا۔ اب اگر گناہ کا سرچشمہ خود مخلوق کا عمل ہو جیسا کہ ہے تو ایسی صورت میں اگر خداوند تعالیٰ اسے بخش دے تو اس کا کرم ہے اور اگر سزا دے تو اس کا انصاف ہے۔“

امامؑ کی سیاسی رہبری

امام کا ایک کردار معاشرے کی سیاسی اور اجتماعی رہبری ہے۔ ساتویں امام موسیٰ بن جعفرؑ کا دور خلافت منصور کے آخری برسوں، خلافت ہادی کے کمکل دور اور خلافت ہارون کے تیرہ سال تک تھا۔ در حقیقت یہ دور خلافت عباسیہ کے عروج اور شیعوں اور علویوں کے لئے سرکوبی، جس اور ظلم و تشدد کا دور تھا۔ منصور کے دور اقتدار میں بیشتر سادات اور علوی جو حکومت حق کے قیام کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا جو عترت کے زیر اثر تھے، بے رحمی کے ساتھ شہید کر دئے گئے تھے۔ امام نے اس زمانے میں حکومت کے خلاف جدوجہد کی در پردہ رہنمائی کی ہے۔ سادات اور علوی، جو تحریک کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ان میں شاید امام کے وجود نے جوش و ولہ پیدا کر دیا تھا۔ امام نے شہید سادات کے پس ماندگان کی دیکھ بھال اور مومنین کی رہنمائی کی۔ بنی عباس اسی وجہ

سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے، ابن خلکان نے ”وفیات الاعیان“ میں لکھا ہے کہ خلیفہ عباسی مہدی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا: ”کیا مجھ کو تمہاری بغاوت سے امان مل سکتی ہے؟“ - ”مُتّهی الامال“ (باب نہم، فصل پنجم) میں آیا ہے کہ ہارون نے امام موسیٰ بن جعفرؑ کے متعلق کہا کہ: ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا قتنہ نہ برپا ہو جائے کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔“ یہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ امام خاموشی سے امت کی رہبری کا کام انجام دیتے رہے اور حکومت کے انحراف اور ظلم و تشدد کے خلاف مقابلہ کے وسائل بھی بہم پہنچاتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہارون امام کو مدینہ سے بغداد کیوں لاتا اور سالہا سال قید تھائی میں ان پر نظر کیوں رکھتا۔ حالانکہ ہارون امام کی منزلت سے واقف تھا مگر ان کی طرف سے اپنے اقتدار کے لئے سخت خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ کتاب ”مخصر اخبار الدول“ میں امام کے حالات کی شرح کے ضمن میں منقول ہے کہ مدینہ میں جب امام ہارون کے سامنے تشریف لائے تو ہارون نے غیر معمولی طور پر ان کا احترام کیا، جب آپ تشریف لے گئے تو مامون نے باپ سے پوچھا کہ ”یہ آدمی کون تھا؟“ ہارون نے جواب دیا: ”یہ تمہارے چچا ہیں جنہیں تم نے آج دیکھا، یہ ہر شخص کے مقابلہ میں امت اور پیشوائی کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن اگر میں دیکھوں گا کہ میرے خلاف کوئی تحریک اٹھا رہے ہیں تو میں انہیں ختم کر دوں گا۔“^(۱)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہارون اپنے تمام تر اقتدار و جبروت کے باوجود امام کی جانب سے ہمیشہ خائف اور ہر اساح رہتا تھا۔ شیعوں کے ائمہ ظلم و ستم، انحراف، علیحدہ پسندی اور نفاق و کفر کی قوتوں کے خلاف معمر کہ میں سب سے آگے تھے۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے صفویان بن یحییٰ سے فرمایا کہ: ”جو شخص کسی طرح بھی یہ چاہتا ہو کہ ظالم باقی رہیں تو وہ بھی ظالم ہے۔“

دو وجہ سے سربراہان حکومت ائمہ شیعہ سے بے حد خوفزدہ رہا کرتے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے علمی منزلت اور فضیلت کی وجہ سے عوام کے محبوب تھے، ایسی حالت میں جب نیزہ و ششیر اور رزو زور سب خلفاء کے اختیار میں تھا ائمہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور دوسری وجہ

اسلامی جہاد اور ائمہ کی سیاسی رہبری تھی۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہارون کے تاثرات ہمارے بیان کردہ نکات کے مظہر ہیں۔ ایک طرف تو ہارون امام کے فضائل، مدارج علمی اور روحاںی کمالات سے واقف تھا، جو امام سے کینہ اور خوف دشمنی کی ایک وجہ تھی دوسری طرف ساتویں امام کی معرکہ آر انقلابی رہبری کی وجہ سے بہت خوفزدہ تھا۔

امامؑ کی علمی و فکری رہبری

علوم و معارف اسلام کی اشاعت اور مکتب اور نظریات کی حفاظت امام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ کے بعد امام موسیٰ بن جعفرؑ نے معارف اہل بیتؑ کی تدوین اور نشر و اشاعت کی عظیم تحریک کو پورا کرنے کی ذمہ داری ادا کی۔

جس دور میں امام موسیٰ کاظمؑ نے امت کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالی، وہ دنیا نے اسلام میں غیر اسلامی انکار اور نظریات کے بھوم اور مختلف فلسفی اور کلامی مکاتب فکر کے ظہور کا دور تھا۔ ایک جانب ہندوستانی، مسیحی اور یونانی انکار خلل ڈال رہے تھے تو دوسری جانب زندیق، صوفی اور دہریہ جیسے دیرانی نظریات عروج پر تھے۔ امامؑ نے اسلام کی حقیقوں اور اس کے علوم و معارف کی تشریع کے ذریعہ دین کے مذاہ کی حفاظت کی۔ شیعہ فقہ و حدیث اور کلام کی کتابیں جو امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بیانوں سے بھری پڑی ہیں اور اس سب سے زیادہ آسودہ علمی میراث میں سے ایک ہے جو ائمہ نے چھوڑی ہیں۔ ہشام بن حکم، یوس بن عبد الرحمن، صفویان بن یحییٰ، محمد بن ابی عمر، عبد اللہ بن المغیرہ، حسن بن محبوب السراو، احمد بن ابی نصر بزنطی، معمِر بن خلاف، عبد الرحمن بیکی، علی بن جعفر، اسحاق بن عمار صیری، اسماعیل موسیٰ بن جعفر، حسین بن علی بن حصال، داود رقی، عبد السلام بن صالح حضری، موسیٰ بن کبیر اور سیکڑوں برگزیدہ علماء و افاضل جنہوں نے علم الکلام، حدیث و فقہ کے میدان میں نئی نئی گہرائیاں اور وسعتیں پیدا کیں، یہ سب امام موسیٰ بن جعفرؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کے

ربانی علم سے فیضیاب ہوئے تھے۔

صدر المتألهین ملا صدر احادیث عقل کی شرح میں جو امام موسیٰ کاظمؑ نے ہشام ابن حکم سے بیان کی تھی، لکھتے ہیں: ”یہ حدیث ایسی خصوصیات عقل کی حامل ہے کہ دوسرے صاحبان نظر و انشور اور عرفانی کتابوں کی کئی جلدیں بھی اس کے مثال نہیں ہو سکیں۔ اس حدیث کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں ماوراء طبیعت، فلکیات، نفسیات، علم الاخلاق اور تمدنی سیاست کے متعلق اشارات و مواعظ، پندو نصائح اور حیات آخرت کی توجیہ کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔“^(۱)

مصری اہلسنت فاضل ڈاکٹر محمد موسیٰ کتاب ”الفقه الاسلامی“ میں لکھتے ہیں: ”وہ پہلے شخص جنہوں نے فقہ میں مرتب کتاب چھوڑی، امام موسیٰ بن جعفرؑ تھے، جنہوں نے ۳۱۸۳ھ میں زندان میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔“^(۲) یہ تمام باقی ان حقائق کا مظہر ہیں کہ کس طرح ایک امام ظلم و ستم اور سختیوں کے پرآشوب دور میں بھی مکمل دین اسلام کی ہمہ گیری کا تحفظ، اس کی شرح اور اس کے افکار و عقائد کی نگرانی کرتا ہے۔

امام کی روحانی منزلت

امام انسانوں کے لئے فیوض رباني کا ایک وسیلہ ہے۔ وہ احساسات سے ماوراء باطنی آفاق میں بھی پرواز رکھتا ہے اور ولایت کی حقیقت کا حامل ہوتا ہے۔ امام کو عام انسانی پیمانے سے نہیں جانچا جاسکتا ہے امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی بھی اسی ماورائی حقیقت کا سرچشمہ تھی حتیٰ کہ شہادت کے بعد بھی فیضان امام جاری رہا۔ اسی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے کاظمین میں امام موسیٰ کاظمؑ کی بارگاہ کا نام ”باب الحوانج“ رکھا ہے یعنی وہاں ہر شخص کی آرزوؤں کی تکمیل منجانب اللہ ہو جاتی ہے۔

(۱) دورنمائی از زندگانی امام موسیٰ بن جعفرؑ، ص ۲۸

(۲) الفقه الاسلامی، مدخل درایہ نظام المعاملات فی، ص ۱۶۰

امام کی معنوی و روحانی و عرفانی منزلت مختلف روایات سے ظاہر ہوتی ہے۔ امن سعد یافی کتاب ”روض الریاحین“ میں شفیق بخشی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شفیق نے کہا: ”۹۱۷ھ میں حج کے سفر پر روانہ ہوا، قادر یہ پہنچ کرنا گاہ اس کی نظر ایک خوبصورت نوجوان پر پڑی جو پشمینہ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ شفیق کہتا ہے: میں یہ سمجھا کہ وہ صوفیا میں سے کوئی ہے۔۔۔۔۔ آگے بڑھاتا کہ اسے ملامت اور نصحت کروں، مگر میں جو نہیں اس کے قریب پہنچا اس نے صریحی طور پر میرے نام سے مجھے مخاطب کیا اور کہا: {اجتَبَيْ أَكْثَرَ أَمْنِ الظُّنُونِ إِنَّ بَعْضَ الظُّنُونِ إِنْمَ} یعنی سوگھن سے پرہیز کرو کہ اکثر ظن گناہ کا باعث ہوتا ہے۔“ میں عجلت کے ساتھ اس کے پیچھے میں روانہ ہوا مگر اس تک نہ پہنچ سکا اور وہ میری نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں واقعہ پہنچا۔ وہاں اس جوان کو نماز میں مشغول دیکھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تا کہ وہ نماز ختم کر لے تو اپنے گمان کے لئے معافی مانگ لوں، لیکن نماز ختم کرتے ہی وہ اچانک میری طرف مڑا اور بولا: {وَإِنِّي لَغَافِرٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَأَعْمَلَ صَالِحًا} (یہ قرآن کی ایک اور آیت ہے) جس کا مطلب ہے ”میں توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا اور ان گناہوں کو چھپانے والا ہوں“ جب منی پہنچا تو اسے ڈول ہاتھ میں لئے کنوئیں کے پاس پایا۔ اچانک ڈول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کنوئیں میں جا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ یہ کبارگی اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا: ”انت ربی اذا طمئت الى الحاء وقوتي اذا اردت الطعام اللهم انت تعلم يا الله وسیدی مالی سواها فلا تعومنی ایاها“ ”اے خدا تو ہی میرا سب کچھ ہے۔۔۔۔۔“ میں نے دیکھا کہ کنوئیں کا پانی اہل کراو پری سطح تک آگیا۔ آسانی سے پانی لینے کی صورت پیدا ہو گئی۔^(۱) یہ واقعہ ائمہ کے ماورائی منزلت اور روحانیت کا مظہر ہے۔ شفیق اس واقعہ کے آخر میں اعتراف کرتا ہے کہ ”موسیٰ بن جعفرؑ عظیم اقطاب و ابدال میں سے ایک تھے۔“ ساتویں امام کی زندگی کا ہر لمحان کی منزلت امامت و ولایت کا شارح رہا ہے۔

(۱) المجالس السنن، ج ۲ ص ۵۲، ۵۳، ارشاد، مفید، ص ۲۶۰ مnocول از دورنمائی، زندگانی امام موسیٰ بن جعفرؑ

امام رضا علیہ السلام

امام رضا کا تجزیہ — امام رضا اور ان کا طریقہ کار

ائمه عترت چونکہ دنیا کے ہر گوشه اور ہر دور کے لئے نمونہ ہیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے انھیں ہر طرح کے حالات سے دوچار رکھا تاکہ ہر حالت میں ان کا کردار، طریقہ کار اور حکمت عملی آئندہ نسلوں کے لئے ایک نمونہ جاوید رہے۔ لہذا اس تابناک سلسلہ عصمت کی ہر فرد خاص قسم کے مختلف حالات سے دوچار رہی اور مختلف قسم کے حالات میں حق کی پاسداری، حقیقت کے تحفظ، "پیغام" کی تبلیغ و ترویج اور اس کی چارہ سازی (Tactics) اور اسٹریٹجی کے لئے مخصوص طریقہ کار کا انتخاب کیا۔ ائمہ کے رکھ رکھاؤ کو سمجھتے اور ان سے اپنی رہنمائی پانے کے لئے ہمیں چاہئے کہ دشمن کے حالات، اسلوب اور اسٹریٹجی کے مقابلے میں اپنے ائمہ کی حکمت عملی کا تجزیہ کریں۔

ائمہ عصمت کے درمیان جن حالات سے امام رضا دوچار رہے، وہ انتہائی قابل غور ہیں۔ کیونکہ ایک طرف "مکر" باطل علمبردار ہے اور دوسری طرف "مکاری" کے جواب "کارہبر" بحق۔

امام رضا کی چال

امام رضا کو جو "اقدار اسلامی" کے علمبردار ہیں اپنا ولی عہد کیوں نامزد کرتا ہے اور یہ حکم جاری کرتا ہے کہ خلافت عباسیہ کے زیر نگین تمام قلمرو میں واعظین امام رضا کے نام کا خطبہ پڑھا کریں؟ امام رضا کو کیوں مدینہ سے بوا کر اپنی ولیعہدی کی پیش کش کرتا ہے اور کیوں انہیں سخت مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں؟

پہلا نکتہ جو ہم اس اقدام سے سمجھ سکتے ہیں، وہ امام کے اثرات اور ان کے سماجی سیاسی کردار کی اہمیت ہے، کیونکہ امام رضا، جو دنیا میں سب سے بڑا صاحب اقتدار بادشاہ تھا، جب تک امام

کے سیاسی سماجی اور جنگی توانائی کے وزن کو سمجھنہ لیتا، امام کے آگے، جن کو وہ اپنے نظام کا دشمن سمجھتا تھا، ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔ نمکن تھا کہ مامون ایک گوشہ نشین شخص کو، جو سیاست سے بے تعلق تھا مدینہ کی گلی کے ایک گھر کے کسی گوشہ میں یا مسجد نبوی میں وعظ یا روحانی و معنوی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو، مدینہ سے پایہ تخت میں بلوائے اور اسے اپنے نظام خلافت کا دشمن سمجھتے ہوئے بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس عمل سے مامون کی نیت کیا تھی؟

اس زمانے کے سرکاری مورخوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مامون کا یہ فعل حق پرستی اور انصاف کا نتیجہ تھا۔ مثلاً طبری لکھتا ہے کہ "امام رضا کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون کا مشا یہ تھا کہ: إِنَّهُ نَظَرٌ فِي بَنِي الْعَبَّاسِ وَبَنِي عَلَىٰ فَلَمْ يَجِدْ أَحَدًا هُوَ أَفْضَلُ وَلَا أَوْرَعٌ وَلَا أَعْلَمُ مِنْهُ۔" (مامون نے دیکھا کہ بنی عباس اور اولاد علیؑ میں امام رضا سے بڑھ کر مقنی اور صاحب علم کوئی نہیں ہے۔) یقوبی اور ابن اثیر اسی نظریہ کو دوہرائے ہیں۔^(۲)

اصفہانی بھی یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مامون صدق نیت سے عہدہ خلافت امام رضا کے نام منتقل کرنا چاہتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں، مامون کے ساتھ امین کی خون آشام جنگ کے دوران مامون نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ فتحیاب ہو جائے گا تو خلافت کو اولاد علیؑ کی افضل ترین فرد کے نام منتقل کر دے گا۔ چونکہ امام رضا سب سے افضل تھے، اس لئے مامون نے خلافت ان کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔^(۳)

فخری بھی مورخین کے اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو مامون کے اس فیصلہ کو صدق نیت پر محمول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

إِنَّ الْمَأْمُونَ فَكَرَ فِي حَالِ الْخِلَافَةِ بَعْدَهُ وَأَرَادَ أَنْ يَجْعَلَهَا فِي رَجْلٍ يَضْلَعُ

(۱) طبری، ج ۷ ص ۱۳۵

(۲) ملاحظہ ہو: ابن اثیر، اکامل، ج ۱، ص ۱۱۱، یقوبی، ج ۲، ص ۲۶

(۳) مقابل اطابیں

بِهَا الْقَيْزَرِ اَيْ ذَمَّةٍ كَدَّا رَعَمَ^(۱)

مگر حقیقت یہ ہے کہ مجموعی مقاصد اور عمومی مفادات کے لحاظ سے مامون میں اور دیگر خلفاء میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ہوس کا بندہ اور صاحب قوت و ثروت تھا اور اس کا آخری مقصد ذاتی اقتدار کا استحکام تھا اور اس معاملہ میں اس نے اپنے بھائی کے قتل سے بھی گریزنا کیا۔

امام رضا کو اپنا ولی عہد اور غلیظ نامزد کرنا بھی، اپنے اقتدار کے استحکام اور اپنے شمنوں کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ شیعہ مفکرین نے ہمیشہ اس بات کو مانے سے انکار کیا ہے کہ مامون کا یہ فیصلہ صدق نیت پر مبنی تھا اور یہ واضح کیا ہے کہ مامون کا یہ اقدام صرف سیاسی مصلحت کی بنیاد پر تھا۔^(۲) مورخین کا وہ گروہ جو مامون کے اس فیصلہ کو ایک صادقانہ فیصلہ بتاتا ہے، ان کا مقصد مامون کو انصاف پسند اور حق دوست ظاہر کرنا ہے۔ ان کی کوشش مامون ہی کے منصوبے اور اس طرز تجھی کا حصہ ہے۔ مقاصد کے اعتبار سے مامون اور دیگر خلفاء میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب اقتدار کے دیوانے تھے۔ مگر دو باتوں میں وہ اپنے خلفاء سلف و خلف سے مختلف تھا۔

اولاً یہ کہ مامون دوسرے تمام خلفاء کے مقابلے میں بہت زیادہ چالاک تھا، اور اس لحاظ سے اسے عباسی معاویہ کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح امیر معاویہ نے حکومت کے لئے طاقت کو سفارتکاری (Diplomacy) سے ملا دیا تھا، اسی طرح مامون بھی طاقت کے ساتھ سیاست کو استعمال کرنے کے فن میں ماہر تھا۔ وہ کہیں زیادہ چالاک تھا کہ طاقت کو اقتدار کے استحکام کا واحد ذریعہ سمجھتا، بلکہ ڈپلومیسی، سیاست اور اچھوتا سیاسی تدبیر (Tactics) اپنانے کی طرف بھی اس کا رخ تھا۔ اسی طریقے سے اس نے عرب عماکدین اور عباسیوں کی مخالفت اور امین کا چھوٹا بھائی ہونے کے باوجود، امین کو راستے سے ہٹا دیا اور خود خلافت پر قبضہ کر لیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مامون

(۱) اغفری، ص ۱۹۸

(۲) مثال کے لئے دیکھیں: رضا لمظفر: تاری الشیعہ معروف به عقیدۃ الشیعۃ الامامیۃ، ص ۱۶۱

علامہ طباطبائی: شیعہ در اسلام و علامہ سید علی نقی: زندگانی امام (رہنمایان اسلام) حصہ ۸ (پاکستان ایڈیشن)

دوسرے اموی اور عباسی خلفاء کے مقابلے میں نسبتاً اچھا علمی فکری اور ثقافتی ذوق رکھتا تھا اور اپنا ظاہر ایسا بنائے رکھتا تھا۔ گویا وہ علم و فضیلت کا دوستدار اور حق و انصاف کا طرف دار ہے۔ صاحب فخری اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”کَانَ الْمَأْمُونُ مِنْ أَفَاضِلِ الْخَلْفَائِهِمْ وَكَانَ فَطَنًا شَدِيدًا۔“^(۱) (یعنی ”مامون دوسرے عباسی خلفاء سے زیادہ چالاک تھا۔“)

سیوطی کہتے ہیں: ”کَانَ أَفْضَلُ رِجَالِ بَنْيِ الْعَبَّاسٍ حَزَمًا وَعِلْمًا وَرَهْبَاءً۔“^(۲)

مامون کی چالاکی، علم اور سیاست یہ وہ دو اہم باتیں تھیں جو حکومت میں اس کی قوت اور فریب کی آمیزش کا سبب بنتیں۔
مامون کا مقصد —

”طاقت، کو اقتدار میں اور فرمان، کو شرع، میں بدلتا

مامون جو دوسرے خلفاء کے مقابلے میں زیادہ چالاک تھا یہ نکتہ سمجھ چکا تھا کہ ”طاقت، و اقتدار اور ”حکومت، اور ”شرعی حیثیت“ میں کیا فرق ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ”حکومت“ عوام کی نظرؤں میں ”شرعی حیثیت“ سے محروم ہو تو وہ ”طاقت“ ہوتی ہے، اقتدار نہیں اور وہ ہمیشہ متزلزل اور خطرات میں گھری رہتی ہے۔ شرعی حیثیت کے بغیر ”طاقت، اقتدار“ (عمانیاتی اصطلاح کا) میں نہیں بدلتا۔

عباسیوں نے امویوں سے جنگ کے دوران اپنی تحریک کی ”شرعی حیثیت“ کو پیغمبر و آل پیغمبر سے انتساب کے ذریعے حاصل کیا تھا اور امام حسینؑ کے انتقام کے نام پر اپنی اموی مخالف تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ

اقدار کو اصل حق دار یعنی آل محمدؐ کے سپرد کر دیں گے، مگر اموی حکومت کے زوال کے بعد عنان حکومت خود ہی سنبھال لی اور پچھلے نفرے بھول گئے۔ اسی وجہ سے عراق، خراسان اور فارس کے عوام کی نگاہوں میں جو آل محمدؐ اور انہم اہلبیتؐ کی طرف جھکا اور رکھتے تھے، ان کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی اور امویوں کی طرح شمار کئے جانے لگے۔

مامون کی غالباً یہ خواہش تھی کہ امام رضاؐ کی ولی عہدی کا جاہ پھیلا کر ”طاقت“ کو ”قدار“ میں تبدیل کرے اور ”حاکیت“ کو عوام کی نظر میں ”جاڑ“ بنادے۔ وہ امام رضاؐ کو اپنے سماجی اور سیاسی نظام کی توجیہ کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن امامت نے اپنے پنے تسلی اور ربانی عمل اور حکومت کے ذریعہ اس طاغوتی منصوبہ پر پانی پھیر دیا اور ولی عہدی کو توجیہ نظام کا وسیلہ بننے کے بغایے اسی نظام کو کچل ڈالنے کے اسلحے میں تبدیل کر دیا۔

دوسرامقصد—عوام کی نظر میں حکومت کی ساکھہ کو بدلتا

مامون اپنے اس اقدام کے ذریعے عوام کی نظر میں خلافی نظام کی ساکھہ کو بدلتا چاہتا تھا۔ امویوں کے دور سے خصوصاً یزید کے زمانے سے حکومت میں ایک عجیب وحشی پن، درندگی (بربریت)، اور تمن کشی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ عباسیوں کے بر سر اقتدار آنے کے بعد سفارح، منصور اور ہارون کی خون آشامیاں اور درندگی اس کیفیت کے باقی رہنے کا باعث ہوئی۔ اس پر امین و مامون کی خانہ جنگی نے اس ساکھہ کو بدلتے میں کوئی مدد نہ کی۔

مامون چونکہ چالاکی کے لحاظ سے تمام سابق خلافاء سے مختلف تھا، اس لئے وہ حکومت کے بارے میں اس عام تاثر کو بدلتا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک طرف تو اس نے خود کو علم دوست ظاہر کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود کو حق و فضیلت کا طرف دار ثابت کرنا چاہا۔ چنانچہ اپنے پہلے مقصد کو پورا کرنے کی خاطر اس نے تدبیم علمی آمغذی کی اشاعت، اور حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کے ترجموں، علمی مناظروں اور فلسفیانہ نشستوں کا سلسلہ شروع کیا اور دوسرے

مقصد کی تکمیل کے لئے اہلبیتؐ کے فضائل کا اقرار خصوصاً امیر المؤمنینؐ کے مرتبہ کا اعتراف، سادات کا احترام اور امام رضاؐ کی ولی عہدی کا اعلان کیا تاکہ اسے حق پسند سمجھا جانے لگے۔ یہ دونوں اقدام مامون کی ایک ہی پالیسی کے دو پہلو ہیں جن کا مقصد حکومت کے لئے شرعی حیثیت عوامی اور مقبولیت پیدا کرنا اور حکومتی نظام کی ساکھہ کو بدلتا تھا۔

تیسرا مقصد—ابھرتی ہوئی شیعہ تحریک کو بدلتا

اس دور میں شیعیت ایک عوامی انقلابی قوت کی صورت میں ابھر آئی تھی اور شیعہ، نظام حاکم کے خلاف حزب مخالف کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ دنیاۓ اسلام کے گوشے گوشے میں بالخصوص خراسان میں انقلاب کا آتش فشاں تیار تھا اور لاواپھوٹنے ہی والا تھا۔ مامون امام رضاؐ کی ولی عہدی کے اعلان سے اس آتش فشاں کو سردا رکنا چاہتا تھا، لاوے کو پھوٹنے سے روکنا چاہتا تھا، انقلابیوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنا اور تحریک میں پھوٹ ڈالنا چاہتا تھا اور تحریک کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر امام رضاؐ کی حکومت عملی نے تحریک کو اور زیادہ پھیلایا۔

شیعہ عربی مصنف ہاشم معرفہ اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لکھتا ہے کہ: ”جب مامون نے دیکھا کہ شیعہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ اس کے ارکانِ دولت میں بھی شیعہ ائمہ اور شیعیت کی طرف جھکا اور پایا جانے لگا ہے، تو اس نے اس کا سد باب کرنا چاہا۔ چنانچہ امام رضاؐ کی ولیجہدی کا اعلان شیعہ تحریک کو پھیلنے سے روکنے کی ایک چال تھی۔ ایک طرف وہ تحریک کی آگ کے سرد ہونے کا منتظر تھا، دوسری طرف انقلابیوں کے رہبر کو پایہ تخت میں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔“^(۱)

۱۳ جو سے یعنی جب سے عباسی بر سر اقتدار آئے، مختلف شیعی انقلابات کا ایک تسلیل ساقائم ہو گیا، یہاں تک کہ بعض وزراء بھی شیعی روحانیات رکھتے تھے اور خلافت کو بنی فاطمہ کی طرف منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ (ابی سلمہ انخلال نے ابی عباس سفارح کے دور میں اور یعقوب بن داؤد نے

(۱) سید ہاشم معروف، عقیدۃ الشیعہ الامامیہ، ص ۱۶۱

المہدی کے دور میں ایسی ہی جدوجہد کی۔) امین اور مامون کے دور میں بھی بڑی بڑی شیعہ تحریکیں ہوئیں۔ محمد بن ابراہیم اور ابی السرایا کے انقلابات یا محمد دیباج بن امام جعفر صادق کا قیام ایسا ہی ہے۔ دراصل شیعہ تحریکیں اور انقلابات مامون کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اس دور میں ہر دور سے زیادہ شیعوں کی جدوجہد و سعی اور انقلاب کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ مامون کے لشکر کا سپہ سالار طاہر بن حسن خود شیعی خیالات کا حامل تھا۔

امام رضا کی ولی عہدی سے مامون یہ چاہتا تھا کہ اس بہانے سے شیعوں کو جھوٹوں نے ایک حزب مخالف کی شکل میں مقابلہ کا نقشہ بنارکھا ہے ان کو مورچوں سے باہر کھینچ کر (اس) مقابلہ کا خاتمہ کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ امام کے انقلابی مقام و منزلت پر کاری ضرب لگائے اور شیعوں کی امکانی (Potential) انقلابی طاقت کو دبادے۔ اس زمانے تک شیعہ ہمیشہ ایک مخالف قوت اور محاذی عضر سمجھے جاتے تھے جو پہاڑوں اور درڑوں میں موجود کردی کرتے تھے۔ مامون امام رضا کو ولی عہدی قبول کرنے پر اس لئے مجبور کر رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ مقابلہ پر ایک ضرب لگائے جس نے حکومت سے پل بھر کا چین بھی چھین لیا تھا۔ مگر امام رضا نے اپنی رہبری کی خداداد استعداد کی بنیا پر اس کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تحریک کو اور پھیلادیا حتیٰ کہ مامون امام کو شہید کر دینے پر بزم خود مجبور ہو گیا۔

چوتھا مقصد—امام کی شخصیت کو توڑنا

حکومت کا مقصد امام کے انقلابی شخصیت پر ضرب لگانا تھا۔ امام کی شخصیت کو کمزور کرنے کے لئے مامون نے دوسرے طریقے اور تدبیریں بھی آزمائیں مثلاً علم کلام کے چندہ تجربہ کار ماہروں کے ساتھ امام کے مناظرے کرانا تاکہ امام کبھی مشکلت کھا جائیں اور ان کی علمی وقت محروم ہو جائے، لیکن ہر مناظرہ میں امام کی شخصیت اور بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی۔

پانچواں مقصد—

داخلی دشمنوں کے خلاف اقتدار کی جنگ میں شیعہ طاقت کا استعمال

یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ امام رضا کی ولی عہدی کے اعلان سے مامون ایک تیرے سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف شیعوں کے انقلابی رجحانات کو قابو میں رکھنا اور دوسری طرف اس عظیم قوت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا۔ ابھی تک مامون کے اقتدار کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں اور عرب عمالک دین مامون کے مقابلے میں امین کے طرفدار تھے اور مامون اقتدار کے مرکز کو عرب عمالک دین کی طرف سے بدلتا ہے ابھی خراسان کی طرف کر دینے کی کوشش میں تھا۔ اہلبیت سے ظاہری دوستی مخفی اس خیال سے تھی کہ شاید اس طرح ایرانی عوام اس کے حامی ہو جائیں۔ امام رضا کی ولی عہدی کے اعلان سے انقلابی شیعوں کی عظیم قوت کو وہ اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اور ابھی خراسان کی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا جو زیادہ تر شیعی رجحانات رکھتے تھے اور جن کی مدد سے اپنے داخلی دشمنوں کی شکست دے سکتا تھا۔ عرب کے عوام چونکہ امین کے طرفدار تھے لہذا اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فارس اور خراسان کے عوام پر بھروسہ کرے۔

چھٹا مقصد—خراسان کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنا

امام رضا کی ولی عہدی کے اعلان سے مامون کا ایک اور مقصد خراسان والوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا، یہاں تک کہ امین کی شکست کے بعد بھی وہ اپنے اقتدار کی هفاظت کے سلسلے میں خراسان والوں ہی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کی ماں جس کا نام مر الجل تھا خود بھی خراسان ہی کی رہنے والی تھی۔ امین اور مامون کی خونی خانہ جنگی درحقیقت عرب اور فارس و خراسان والوں کے بیچ کھینچنا تھی۔ مامون کا وزیر فضل بن سہل ایرانی تھا اور امین کا وزیر فضل بن ریبع عرب تھا۔ اقتدار بچانے کے لئے مجبور امامون زیادہ تر ایرانیوں اور خراسانیوں پر بھروسہ کرتا تھا۔^(۱) چوں کہ اکثر خراسانی شیعی رجحانات رکھتے تھے،

(۱) طبری، ج ۷ ص ۱۵۹ / ابن اثیر الکامل، ج ۶ ص ۱۰۱

اس وجہ سے ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مامون مجبوراً خود کو اہلیت کا دوست ظاہر کرتا تھا۔

شہادت امام رضاؑ—مامون کی اسٹریچی کی ناکامی

امام رضاؑ کی ولیعہدی کے سلسلہ میں مامون کا اقدام، عباسی نمک خوار مورخین کے نظریے کے بخلاف، مخلصانہ نہ تھا بلکہ یہ اقدام قطعی سیاسی اور ریا کارانہ تھا، مگر امامؑ نے خداداد حکمت عملی کے ذریعہ مامون کے نقشہ کو نقش برآب بنادیا۔

امامؑ نے مختلف طریقے اور اظہار کراہت کے ذریعہ مامون کو اس کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ ولیعہدی کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے سچے پیغام، شیعیت کی تبلیغ، حکومت اور موجودہ نظام کو پابند بنانے کا کام کیا۔ امامؑ کے اسی عظیم کارنامے نے مامون اور حکومت کو اس درجہ خوفزدہ کر دیا کہ بالآخر گھبراہٹ کے عالم میں مامون نے انہیں زہر دلو کر شہید کروادیا۔ امام رضاؑ کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حکمت عملی کے مقابلے میں مامون کی چال مات کھا گئی۔ خلیفہ نے امامؑ کو زہر دے کر اپنی کمزوری اور بے چارگی کا اعتراف کیا ہے۔ مَكْرُوا وَ مَكْرُ اللَّهُ وَ الْخَيْرُ الْمَا كِرِينَ۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی

مامون اور اس کی خلافت کی اسٹریچی کے مقابلے میں امامؑ کی حکمت عملی کیا تھی؟ امام رضاؑ کی حکمت عملی بالکل نئی، بے حد حساس اور بہت زیادہ قابل غور ہے۔ حکمت عملی پوری طرح تازہ اور نئی ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے شیعہ ائمہ مقابلہ کو بڑھانے کی غرض سے ہمیشہ دارالخلافہ سے دور رہتے تھے مگر امام رضاؑ نے مجبوراً ولیعہدی قبول کی اور دارالخلافہ میں رہ کر مقابلہ کو آگے بڑھایا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی بے حد حساس ہے، اس لئے کہ انقلابی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے دارالخلافہ سے دور رہنا، ولی عہدی قبول کر لینے سے زیادہ آسان تھا، لیکن امام رضاؑ نے تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ولی عہدی کو ذریعہ اور سیلہ کے طور پر استعمال کیا۔

یہ حکمت عملی بے حد قابل توجہ ہے کیوں کہ حق و باطل کی کشکش میں طرح طرح کی تدبیریں اور مختلف طریقہ کا استعمال ہوا کرتے ہیں۔ کبھی 'تعود' یعنی بیٹھنے (صلح حسن) اور کبھی قیام یعنی اٹھنے (جہاد حسینی) سے نہ راً آزمائی کی گئی، کبھی خطابت (حضرت زینبؓ) سے کام لیا گیا، کبھی دعا (سید سجادؑ) اور کبھی نشر علوم اور نظریاتی کام (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ) کبھی قید و بند (امام موسیٰ کاظمؑ) اور کبھی مندوںی عہدی (امام علیؑ رضاؑ) کے ذریعہ تحریک کے سچے رہبروں نے مقابلہ کیا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی اس وجہ سے بھی بے حد قابل غور ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خداگی رہبر کس طرح بدترین حالات میں اپنی خواہش کے خلاف جریہ ولی عہدی قبول کر کے بوجوہ احسن اس ولی عہدی سے تحریک کے لئے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

امام رضاؑ نے اس قسم کی حکمت عملی کا انتخاب کیوں کیا؟ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس زمانے کے اسلامی معاشرے کا جائزہ لینا چاہئے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد "معیار"، "مقدار" پر قربان ہو چکا تھا۔ اسلام تیزی کے ساتھ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں پھیل چکا تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد مسلمان ہو گئے تھے مگر ان میں زیادتی ایسے افراد کی تھی جو نام کے لئے تو مسلمان ضرور ہو گئے تھے مگر عملاً وہ دور جاہلیت کے عقائد اور تہذیب کے پابند تھے۔ اگر کسی حد تک اسلام سے آشنا بھی تھے تو یہ وہ اسلام تھا جو انہیں دربار خلافت سے ملا تھا۔ جاز، کوفہ، بصرہ اور یمن کے عوام یعنی دنیا کے اسلام کے مرکز کے لوگ کسی حد تک اسلام سے واقفیت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے شیعی تحریکوں کی ابتداء ان ہی علاقوں سے ہوئی تھی۔ مگر ترکستان، ماوراء النہر، روم، افریقہ، یورپ (اندلس) اور سندھ وغیرہ کے عوام اسلام کی صحیح تعلیمات، ائمہ کی منزلت اور شیعی تحریک سے تقریباً بے بہرہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خلفائے عبادیہ نے شیعی تحریک کو تاتاریوں، ترکوں اور رومیوں کی مدد سے کچلا ہے۔ نسبتاً منصف اور ذمہ دار دانشور جو قلب دنیا کے اسلام کے مرکزی خطہ (جاز، بغداد، دمشق) کے رہنے والے تھے حکومت کے مخالف تھے، اور ائمہ اہلیتؑ کی طرف رجحان رکھتے تھے (یہاں تک کہ ائمہ اہلسنت یعنی ابوحنیفہ، شافعی اور مالک نے بھی حکومت کے کارندوں کے ہاتھوں

ڈرے کھائے اور قید کی سختیاں جھیلیں)۔ حکومت کے پالے ہوئے 'سرکاری علماء کا کام موجودہ نظام حکومت کی توجیہ پیش کرنا ہوتا تھا۔ جو اسلام ترکستان اور ترقیات کے لوگوں تک پہنچا تھا وہ فیلٹور انیوں کے ذریعہ پہنچا تھا۔

واقف کا رعلماء اور عوام تو انہے کو روحاںی اور حقیقی پیشووا کی حیثیت سے سمجھتے تھے جب کہ حکومت کو غیر شرعی سمجھتے تھے لیکن ناقف اور دور دراز علاقوں میں بننے والے افراد حکومت کی قدرن اور غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے انہی کی معرفت نہیں رکھتے تھے۔ صرف حجاز، مدینہ اور کچھ عراق وایران کے محدود علاقوں میں پیغمبر اور اہلبیت کی یادِ دلوں میں باقی رہ گئی تھی۔ علماء کے درمیان امام محمد باقر اور امام صادقؑ کا ذکر نمایاں طور پر ہوتا تھا۔ بقیہ عوام یعنی بخ سے لے کر اندرس تک کے رہنے والے حکومت کی افوہوں اور ریشه دو انیوں کی وجہ سے اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ رسولؐ کے گھر انے پر کیا گذر رہی ہے۔ خصوصاً امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانے میں جو غلیفہ کی قید میں تھے، رسولؐ کے گھر انے اور ترشیح کے ادعاوم کے درمیان رابطہ بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ان ہی حالات میں امام رضاؑ نے امامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور مامون نے ان پر ولیعہدی لاد دی۔ اور انھیں اسے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ایسی حالت میں اگر حکومت کے جر و تشدد کے باوجود امامؑ یہ تہیہ کر لیتے کہ وہ اس پیش کش کو تحریک دیں گے تو زیادہ سے زیادہ وہ شہید ہو جاتے جو علیؑ اور حسینؑ کے دارثوں کے لئے افتخار کی بات تھی، اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا، تاہم بادل ناخواستہ اس پیش کش کو منظور کر لیا تاکہ اسی ذریعہ سے اماموں کے نام اور شیعیت کا یہی یقین عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ امامؑ چاہتے تھے کہ حکومت کی ضرورت کو "برج فریاد" کے طور پر ترشیح کی نقاابت کا ذریعہ بنالیں اور اسی مقام سے شیعیت کی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچا دیں۔

امام حسینؑ نے اپنے خون، حضرت زینبؓ نے اپنی خطابت اور سید سجادؓ نے اپنی دعاؤں سے شیعی تحریک کو اس حد تک حکم بنا دیا تھا کہ اب اس کے وجود کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفرؑ صادقؑ نے شیعہ علوم کو مسلک کی شکل میں مدون کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ولیعہدی

کی پیش کش کو قبول کر لینے سے شیعہ مسلم کی غلط تفسیر کا کوئی احتمال باقی نہ رہا۔ چنانچہ امام رضاؑ نے اپنے اس عمل کے ذریعہ اس تحریک کو پھیلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

امام رضاؑ کی ولیعہدی کی بناء پر پہلی بار عالم اسلام کے تمام مساجد میں ایک خدائی رہبر اور امام اہلبیتؑ کا پیغام خطبہ میں شامل ہوا اور پہلی مرتبہ دنیاۓ اسلام کے سرحدی علاقوں میں رہنے والوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ پیغمبرؐ کے خاندان کی متاز ہستیاں انہی موجود ہیں اور اس درجہ فضیلت کی ماں لک ہیں کہ خلیفہ تک انہیں عالم اسلام کی رہبری کے لئے لاٹ ترین فرد مان لینے پر مجبور ہے۔ امام رضاؑ نے شیعیت کو سی حکومت کے مقابلے میں ایک عظیم سیاسی قوت کی شکل بخشی۔ امام رضاؑ کے لئے ولیعہدی اپنے پیغام کی نشر و اشتاعت کا اور دنیا کے کانوں تک حق کی آواز پہنچانے کا ایک ذریعہ تھی۔

مامون نے خود کو امامؑ کا طرفدار ظاہر کرنے کے لئے احکامات جاری کر دیئے کہ تمام مملکت اسلامی کی مساجد میں جمعہ کے خطبہ میں امامؑ کا نام شامل کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے حکومت کا قومی رنگ سیاہ کے بجائے سبز قرار دے دیا، کیوں کہ سیاہ رنگ بنی عباس کا قومی نشان تھا اور سبز رنگ بنی فاطمہ کا۔ جہشاری لکھتا ہے:

"وَكَانَ الْمُأْمُونُ قَدْ جَدَ فِي تَجْدِيدِ الْعَهْدِ لِعَلَى الرِّضَا الشَّافِعِيَّةِ وَيَقُولُ إِلَى الْفُضْلِ بِإِنْخُذِ الْبَيْعَةَ عَلَى النَّاسِ وَالْكِتَابَةَ إِلَى الْأُقْلِيَّمِ فِي أَبْطَالِ السَّوَادِ وَكَثُبَ الْفَضْلِ إِلَى أَخْيَهِ الْحُسَنِ تَعْلِيمِهِ بِذَلِكَ وَيَأْمُرُهُ بِذَلِكَ وَيَنْهَا بِذَلِكَ السَّوَادَ وَأَنْ يَلْبِسَ الْخُضْرَةَ وَيَجْعَلَ الْأَعْلَامَ وَالْقَلَائِيسَ الْخُضْرَاءَ وَيُنْطَلِبَ النَّاسُ بِذَلِكَ وَكَاتِبٌ فِيهِ جَمِيعُ عَمَالِهِ۔"

اس طرح امامؑ کے نام اور شیعی تحریک کے پیغام کی توسعہ ہوئی۔ جس ہتھیار کو مامون نے امامؑ کے خلاف اور شیعی تحریک کو بیکار کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا، امامؑ نے اسی ہتھیار کو خلافت اور حکومت کے خلاف استعمال کیا اور مجبوری کے باعث جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان ہی حالات سے امامؑ نے شیعی تحریک کے مفاد میں استعمال کیا۔ امام رضاؑ کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک طرف تو ولیعہدی قبول کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ خلافت کو

وہ اپنا حق سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف بار بار مختلف طریقوں سے اس بات کو ظاہر کیا کہ مامون اور اس کی حکومت کے مخالف ہیں اور وہ ولی عہدی کو مجبوراً قبول کر رہے ہیں۔ امام رضاؑ اسی قسم کے حالات سے گزر رہے تھے جن سے تیرے خلیفہ کے قتل کے بعد حضرت علیؑ گذرے تھے۔ حضرت علیؑ نے بھی خلافت قبول کر لی تھی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اگر علیؑ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے تو انہوں نے خلافت قبول کیوں نہ کی؟ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ مجبوراً خلافت قبول کر رہے ہیں۔

امام رضاؑ جانتے تھے کہ ان کا ولی عہد بننا مامون کی توقعات کے خلاف ثابت ہو گا اور ان کی ولی عہدی سے شیعی تحریک ختم نہیں ہو گی کیوں کہ شیعہ وہ مون کی جو امامؑ کی عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امامؑ بھی حکومت کے آله کا نہیں بنیں گے اور ولی عہدی کو قبول کرنے کا مقصد، نظام خلافت کو باطل قرار دینا ہے۔ امام رضاؑ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ وہ مامون کو یہاں تک ہر اس کر دیں گے کہ وہ انہیں شہید کر دے۔ اس طرح ولی عہدی کا قبول کرنا حکومت اور شیعوں کے درمیان مخالفت بڑھانے کا سبب ہو جائے گا، نہ کم کرنے کا۔

امام رضاؑ نے اپنی حکمت عملی سے مامون کی حکمت عملی کو شکست دے دی اور ولی عہدی کو ایک ایسا "منبر بنایا جہاں سے وہ شیعی احتجاج کو عالم اسلام کے گوشے تک پہنچاسکیں۔

ہم امام رضاؑ کی غیر معمولی حکمت عملی کی کامیابی کو اس روڈ عمل سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بعد مملکت اسلامی کے طول و عرض میں مختلف شیعہ انقلابی تحریکیں ابھرنے لگیں اور حکومت اس قدر ہر اسال ہو گئی کہ بعد کے ائمہ کو ہمیشہ یا تو قید میں رکھا گیا یا کڑی نگرانی میں رکھا اور متولی جیسے لوگوں نے دجلہ و فرات کو بے شمار شیعوں کے خون سے رنگیں کر دیا۔

جس طرح امام حسنؑ کی حکمت عملی نے حکومت کے کریہ چہرہ سے منافقت کی نقاب نوج پھینکی اور "معاویہ" یزیدؑ میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح امام رضاؑ نے بھی منافق حکومت کے چہرے سے اسلام دوستی کا نقاب نوج پھینکا تھا اور مامون کو متولی کے روپ میں اپنا اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا تھا کیوں کہ حق اور حق پرستوں کے لئے "معاویہ" اور "مامون" کا مرحلہ ہمیشہ "یزید" اور "متولی" کے مرحلے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

امام محمد تقیؑ -

تاجدار تقویٰ

آپ کا نام محمد بن علیؑ ہے مگر امام جو ادی امام تقیؑ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ آپ کو "ابو جعفر ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔ آپ آسمان ولایت و امامت کے نویں درخشان ستارے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ نے اپنی امامت کا آغاز نوسال کی عمر مبارک میں کیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان نوسال کی عمر میں وہ امامت کی روحانی، تہذیبی اور سیاسی رہبری کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں؟

اس سوال کے جواب میں ہمیں امامت کے عرفانی اور ماوراء طبیعتی ابعاد (Metaphysical Dimensions) پر نظر رکھنا ہو گی۔ ائمہ اور انبیاء فیض خداوندی کی تخلی ہوتے ہیں جو خداوند تعالیٰ کے مخصوص الطاف سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ خالق کائنات اور قادر مطلق کے عنایات خصوصی سے امام پیدائش کے وقت ہی سے خصوصی ملکہ، غیر معمولی روحانی استعداد اور علم حضوری کا حامل ہوتا ہے۔ امام اور بنی چونکہ مستقل طور سے براہ راست علم الہی اور اس کے مخصوص عنایت کے پیشہ سے فیضیاب ہوتے ہیں، اس لئے "علم وہبی" کے مالک ہوتے ہیں اور حواس خمسہ اور (فطری) تربیت کے علاوہ دوسرے ذریعوں سے تحصیل نہیں کرتے۔ ان کا مقابلہ عام انسانوں کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جو شخص آفتاب کی روشنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے وہ اس بارے میں "خبر"، "اطلاع"، "اتکتاب" یا "تحصیل علمی" کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر ائمہ میں

سے کوئی امام نوسال کی کمسنی میں ہی امامت کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے تو اس میں تجھ کی مطلقاً کوئی بات نہیں ہے۔

قرآن کریم حضرت عیسیٰ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ گھوارہ میں بھی نبی تھے اور انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان خود ان الفاظ میں کیا تھا:

{قَالَ إِنِّي عَنْذُ اللَّهِ آتَانِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا} (مریم/۳۰) (میں خدا کا بندہ ہوں اور مجھے کتاب اور نبوت عطا ہوئی ہے۔)

اممہ بھی اسی صنف سے ہوتے ہیں، اس لئے کم از کم کسی مسلمان کو یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنا چاہئے کہ امام محمد تقیٰ نوسال کی عمر میں عہدہ امامت پر کس طرح فائز ہو گئے۔

ہمارے بارہ اماموں میں امام جوادؑ نے عمر کے لحاظ سے اس دنیا میں سب سے کم زندہ رہے۔ جب انہیں زہر دیا گیا، اس وقت ان کی عمر صرف پچیس برس تھی (۱۹۵ھ سے ۲۲۰ھ تک) مگر یہ زندگی جس قدر بھی ہے، ایک ”وقت“ ہے ایک ”طاقت“ ہے۔ اس کا راز (زندگی کے) ”معیار“ میں ہے نہ کہ ”مقدار“ میں۔ کیونکہ اس کا پہنچانہ کتنے سال زندہ رہے، نہیں ہے بلکہ کیسے زندگی گذاری، ہے۔ کسی نے امام جوادؑ کی طرح سے مختصر ہی زندگی گزاری ہو مگر معیار اور تاثیر کے لحاظ سے لاکھوں انسانوں کی سالہا سال کی زندگی سے کہیں زیادہ ہو۔^(۱)

امام محمد تقیٰ کا دور مختصر ہونے کے باوجود نہایت تلاطم خیز لیکن ثمر آور تھا۔ نویں امام کا دور ۲۰۷ھ سے ۲۲۰ھ تک ہے۔ اس وقت جبر و استبداد کا دور دورہ تھا جو شیعوں کی نسبتاً آزادی کے دور کے بعد شروع ہوا۔

اس زمانے کے سیاسی حالات

اس زمانے میں شیعہ دنیا نے اسلام میں سب سے بڑی انقلابی طاقت اور حکومت وقت

(۱) زندگی امام ازا آیت اللہ علامہ علی نقی، ص ۱۸۹

کے لئے بڑا خطرہ سمجھے جاتے تھے اور لاکھوں عوام میں انہمہ اہل بیتؑ کی مقبولیت حکومت کو خوفزدہ کر رہی تھی۔

امام جوادؑ کی امامت سے چند سال قبل عراق میں شیعوں کی زبردست تحریک کی ابتدا ہوئی۔ جمادی الثانی ۱۹۹ھ کے اوآخر میں سادات حسینی میں سے، محمد بن ابراہیم نے جوابن طباطبا کے نام سے مشہور ہیں، کوفہ میں ایک زبردست انقلاب کی رہبری کی۔ یہ لوگ ۱۹۹ھ کے ماہ رب جب میں اس قدر مضبوط اور منظم ہو گئے تھے کہ زہیر بن مسیب کی سرکردگی میں حکومت کی جوفوج ان کے دبانے کے لئے لگئی تھی، اسے ان لوگوں نے بری طرح مار بھاگایا۔^(۱) ۲۰۷ھ میں سرز میں حجاز پر محمد دیباچ بن امام جعفر صادقؑ کی سرکردگی میں شیعوں نے انقلاب برپا کیا اور تھوڑے عرصے تک اس علاقہ پر اپنی حکومت قائم رکھی۔ ۲۰۲ھ میں کوفہ میں ایک دوسری ہمہ گیر تحریک ابھری جس کی رہبری ابی سرابا کے بھائی عبداللہ کر رہے تھے۔ اس تحریک کے پشت پناہ بھی شیعہ ہی تھے^(۲) ان کی معنوی رہبری کے فرائض علی بن محمد بن امام جعفر صادقؑ انجام دے رہے تھے۔

یمن میں بھی شیعہ تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ ۲۰۷ھ میں ابراہیم بن امام موسیٰ کاظمؑ نے زبردست انقلاب برپا کیا اور پورے یمن میں علویوں کی حکومت قائم کر دی۔^(۳) ۲۰۸ھ میں عبد الرحمن بن احمد علوی کی سرکردگی میں ایک اور تحریک ابھر آئی۔

یہ تمام تحریکیں اور انقلابات بتاتے ہیں کہ شیعہ قوی ترین انقلابی طاقت اور حکمرانوں کی مطلق العنانی کے لئے زبردست خطرہ تھے۔

خلافت عباسیہ کو اچھی طرح علم تھا کہ امام رضاؑ اور امام جوادؑ مسلمانوں میں بے حد مقبول اور محبوب ہیں۔

تاریخ میں بہت سے شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمزور عوام کی بڑی

(۱) ملاحظہ ہوا: ابن اثیر، الكامل، ج ۲، ص ۸۲ و ۸۳ / طبری، ج ۷، ص ۱۱ / اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۵۲۸

(۲) طبری، ج ۷، ص ۱۲۳ / طبری، ج ۷، ص ۱۱ / اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۵۲۵

اکثریت کی ہمدردیاں پورے عالم اسلام میں شیعہ ائمہ اور شیعیت کے ساتھ تھیں۔ طبری نقل کرتا ہے کہ حسین بن حسن جو علوی انقلابیوں میں تھے اور ”والی“ کے نام سے مشہور تھے، حج کے زمانے میں جب مکہ آئے تو میں نے دیکھا کہ خلافت عباسیہ کے گورنر جواد بن عیسیٰ نے پہلے توان سے جنگ کا ارادہ کیا مگر پھر اس خیال سے باز آگیا۔ بقول طبری وہ ڈر گیا کہ حج کے زمانے میں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں اگر وہ ایسا کرتا ہے تو سارے کے سارے مسلمان شیعہ سردار کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے ”وَحَشِيَ أَنْ قَاتَلُهُمْ أَنْ يَمْنَأَلَ أَكْثَرُ النَّاسِ مَعْهُمْ“^(۱)

یہ ایک تاریخی گواہ ہے جو وضاحت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ خلافت عباسیہ اس بات سے آگاہ تھی کہ عوام کی اکثریت شیعوں کی حمایت تھی۔

ان حالات میں شیعہ انقلابی قوت اور عوام میں ائمہ اہلبیت کی محبوبیت کے پیش نظر مامون مجبور تھا کہ امام رضا کو اپنا ولی عہد مقرر کرے اور یہ اعلان کرے کہ ہم سیاسی اقتدار اس کے صحیح حقدار یعنی ائمہ اہل بیت کی جانب منتقل کر رہے ہیں۔ امام رضا کی ولی عہدی لان ۲۷ ھجری میں عمل میں آئی۔ درحقیقت مامون کا عمل ایک طرف تو شیعہ تحریک و انقلاب کے خلاف دفاعی چال تھی، دوسری طرف ائمہ کی مقبولیت سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا تھا مگر امام رضا کی ولی عہدی سے حکومت پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ شیعوں کی ہر دل عزیزی نیز سیاسی اور عوامی قوت بڑھتی جا رہی ہے اور سیاسی نکتہ نظر سے شیعہ جو پہلے کی نسبت اسلامی معاشرہ کے قوی ترین عنصر بن چکے تھے، امام رضا کی ولی عہدی کے بل بوتے پر کسی وقت بھی اقتدار پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے امام رضا کو ہر دلواہی اور تین اماموں کو یکے بعد دیگرے یعنی امام محمد تقیٰ، امام علی نقیٰ اور امام حسن عسکریٰ کو زندان کے تید و بند، حراست اور مستقل نگرانی میں زندگی گزارنا پڑی۔ مامون کی سیاسی روشن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قوت سے زیادہ ”فریب اور ریا کاری“ پر بھروسہ کرتا تھا۔

(۱) طبری، حج ۷ ص ۱۴۱

امام جوادؑ کے مقابلے میں مامون کی تکونی چال

امام رضاؑ کی شہادت کے بعد، امام جوادؑ کے مقابلے میں مامون نے سرخی چال اختیار کی۔ اولاً امام سے اپنا نبی و سنبی تعلق ظاہر کر کے ان کی مقبولیت اور محبوبیت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اسی سیاست نے اپنی بیٹی ”ام الفضل“ کا عقد امام جوادؑ سے کرنے پر اکسایا۔ مامون کا یہ اقدام امام رضاؑ کے سماجی اقتدار اور عوامی اثر و نفوذ کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ مامون جیسا صاحب اقتدار خلیفہ عوامی قدر و منزلت پانے کی خاطر امام سے سنبی قربات ظاہر کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مامون کی دوسری سیاست یہ تھی کہ وہ برابر امام کو اپنی نظروں کے سامنے بطور قیدی رکھنا چاہتا تھا تا کہ ان کی حرکات و سکنات پر پابندیاں عائد رکھے اور وہ اپنے عوامی اثر و نفوذ اور مقبولیت کے سہارے حکومت کے خلاف کوئی انقلاب برپا نہ کر سکیں اور جیسا کہ کتابوں میں آیا ہے امام محمد تقیٰ کو اپنی دامادی میں لینے کا مامون کا ارادہ سلامتی کے لحاظ کا کوئی اقدام بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا تھا کہ گھر کے اندر بھی امام پر کڑی نظر رکھی جائے۔ امام جوادؑ کا عمر بھراں طرح حکومت کی کڑی نگرانی میں رہنا اس بات کا شاہد ہے کہ عباسیوں کو امام کے اثرات سے بہت زیادہ خوف و ہراس تھا۔ تیسرا بات، مامون امام کی روحانی شیعیہ کو منع کرنے کی کوشش میں تھا تا کہ عوام میں ان کا اثر اور مقبولیت کم ہو جائے۔ امام محمد تقیٰ کی امامت کے آغاز میں مامون نے دربار میں جو زبردست علماء اور دانشوروں سے مناظرے کرائے کہ امام کو علم الكلام، فقہ اور فلسفہ کے مشکل مسائل میں پھنسایا جائے۔ زبردست ماہروں سے امام کا مقابلہ کرایا۔ مامون کو امید تھی کہ امام جوادؑ جو عمر کے لحاظ سے کم سن تھے، ان تجربہ کا اور پیشہ ور مناظرہ بازوں سے شکست کھا جائیں گے اور حکومت ان کی شکست کو ان کی کم علمی اور فکری کوتا ہی کے طور پر مشہور کر کے ان کی عوامی قدر و منزلت کے انحطاط سے فائدہ اٹھا لے گی۔ اس طرح اسی سلسلے کے ایک تاریخی مناظرے میں مامون نے یہی

بن اثتم کو آمادہ کیا کہ وہ امام سے سخت قسم کے سوالات کرے مگر وہ امام کے منطقی استدلال کے سامنے بے بس ہو گیا۔ مامون اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ وہ خدائی رہبڑیں اور ملکوتی علم کے سرچشمہ سے براہ راست فیض حاصل کرتے ہیں۔

مامون کی موت کے بعد معتصم کے بر سر اقتدار آتے ہی امام پر حکومت کی سختی اور دباؤ میں اضافہ ہو گیا۔ مامون نے فریب دریا کو ترجیح دینا تھا مگر معتصم طاقت استعمال کرنے کا قائل تھا۔ اسی لئے اس کے زمانے میں شیعوں پر قید و بند، ظلم و جور اور ان کے قتل و خون میں اضافہ ہو گیا۔ معتصم کی ہی سازش کے نتیجہ میں ام الفضل نے ۲۲۰ھ میں امام کو زہر دے کر شہید کر دیا۔^(۱)

امام علی نقی -

متولی سے مقابلہ کے سورما

دو سی امام کا اسم گرامی ”علی“، کنیت ”ابو الحسن“ اور لقب ”نقی“ اور ”ہادی“ تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۲۱۳ھ میں مدینہ میں ہوئی۔ آپ کے سر مبارک پر صرف چھ برس تک امام جواد کی شفقت پدری کا سایہ رہا۔ امام جواد کی عراق جلاوطنی اور آپ کی شہادت کے بعد امامت کی رہبری کی عظیم ذمہ داری کا بار آپ ہی کے دوش مبارک پر آن پڑا۔^(۱)

معتصم کی خلافت کے زمانہ میں آپ کی امامت کا دور شروع ہوا۔ ۲۸۷ھ میں معتصم کی موت ہوئی۔ اس کے بعد واثق بالله تخت نشین ہوا۔ اس کی موت کے بعد خلفائے عباسیہ کا سب سے بڑا ظالم اور جابر خلیفہ متولی بر سر اقتدار آیا۔ وہ نگز زمانہ ۲۵۰ھ تک زندہ رہا۔ امام کے مقابلے میں حکومت کی چال متولی کے تاریک دور میں عربیاں ہو کر سامنے آئی۔

امام ہادی کا دور امام جواد کے زمانہ کی توسعی ہے، زمانہ نیزستان کی اور حالات کے لحاظ سے اس سے مشابہ ہے۔ متولی کے بر سر اقتدار آتے ہی عباسی حکومت کا ظلم و استبداد اپنے بام عروج پر پہنچ گیا۔ شیعوں کو جو عباسیوں کے ظلم و ستم اور فساد کے مقابلے پر ایک سورچہ تیار کئے ہوئے تھے، حکومت نے ختم کر دینے کا ارادہ کیا۔ شیعہ بھی عباسی سامراج کو متزلزل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے تھے، یہاں تک کہ متولی کے دور سے قبل ۲۱۹ھ میں محمد بن قاسم بن عمر بن علی بن ابی طالب نے آخری اور سب سے بڑا شیعی انقلاب برپا کیا۔ محمد بن قاسم کا انقلاب ”رقہ“ کے علاقے سے شروع ہوا۔ چالیس ہزار جنگ آزمائشیعہ ان کے ہمراہ تھے۔ محمد بن قاسم نے اپنا مرکز

(۱) امام علی نقی کے زمانے کے حالات، مجاہدات کی تفصیلی جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو: امام ہادی و نہضت علویوں از محمد رسول دریانی، طبع رسالت قلم ناصر خسرو، تهران

خراں میں ”مرہ“ کے قریب کوہ حریر کے قلعہ حصیہ میں منتقل کیا۔ پھر اس کے بعد طالقان کو اپنا مرکز بنالیا۔^(۱) انہوں نے طالقان ہی کو اپنا مستقر بنالیا اور ایرانی علاقوں کے لوگ ان سے منسلک ہو گئے۔ خلیفہ معتصم نے حسین بن نوح کی سرکردگی میں انقلابیوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں بھیجیں۔ مگر سامراجی فوجیں انقلابی مسلمانوں کی قوت ایمان سے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں اور ایک خوزیز جنگ میں بری طرح شکست کھا کر تتر پر ہو گئیں۔ اس کے بعد کی جنگوں میں، نوح بن حیان بن جبلہ اور ابن طاہر، حاکم شہر کی سرکردگی میں بھیجی گئی سامراجی فوجوں کو بھی شیعہ انقلابیوں نے شکست دے دی۔^(۲) چند ہفتے تک پورے علاقے پر شیعہ انقلابیوں کا مکمل قبضہ رہا۔ اس کے بعد بے اندازہ دشواریوں اور زحمتوں کا سامنا کرنے کے بعد عباسی حکومت انقلابیوں کی سرکوبی اور قائد انقلاب پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی۔

ظلم و استبداد، فساد اور انحراف کے خلاف شیعوں کے متواتر اور مسلسل مقابلہ کو فطری (بلکہ سیاسی قہر کے) طور پر عباسی حکومت نے ائمہ شیعہ کو اپنی سخت نگرانی میں رکھنے، انہیں قید میں ڈال دینے اور ان پر زیادہ سے زیادہ ظلم و تشدد کرنے کا بہانہ بنالیا۔

تاریخی شواہد کے مطابع سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام جوادؑ کی شہادت کے بعد عباسی حکومت امام ہادیؑ سے جو مسلمانوں کی روحانی فکری اور اجتماعی رہبری کا فرض انجام دے رہے تھے بے حد ہر اساتھی۔ تاریخی تحریروں میں منقول ہے کہ حرمین (مکہ و مدینہ) کے سرکاری پیش امام نے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے متولی کو لکھا:

”اگر تمہیں مکہ و مدینہ کی ضرورت ہے تو علیؑ بن محمدؑ (ہادیؑ) کو اس علاقے سے ہٹا لے جاؤ کیونکہ انہوں نے اس علاقے کے پیشتر لوگوں کو اپنی اطاعت اور اثر میں لے رکھا ہے۔“

دوسرے مقامات سے بھی عباسی سامراجی مشینی کے کارندوں نے خلیفہ کو امام ہادیؑ کے

(۱) ملاحظہ ہو: اصحابیانی، مقاتل الطالبین، ص ۹۷، ۵، ۴، ابن اثیر، الکامل، ج ۳۰، ص ۱۰۱، بعد تک

(۲) طبری، ج ۷، ص ۲۲۳ و ۲۲۴

بارے میں اسی قسم کی اطلاعات بھیجیں جو ائمہ کی عوام میں محبوبیت اور مقبولیت کی مظہر ہیں۔ اس زمانہ میں جب قصر بغداد میں رہنے والا خلیفہ دنیا کی سب سے زبردست طاقت سمجھا جاتا تھا، اس کا اقتدار دار الحکومت کے علاقوں تک محدود تھا اور اس کے مقابلے میں مسجد النبی میں بیٹھنے والا اور جناب فاطمہ کے مٹی کے گھر میں رہنے والا عوام کی اکثریت کے دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔ دوسرے اس سے یہ حقیقت بھی منکشf ہوتی ہے کہ ائمہ امت روحانی فکری رہبری کے فرض کی انجام دہی اور اسلامی تہذیب کی ترویج کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی معروکوں سے بھی غافل نہیں تھے۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمام قلمرو اسلامی کے شیعہ انقلابی ائمہ ہی سے تحریک حاصل کرتے اور اپنے رہبر کے رابطہ میں رہتے۔ اس مسئلہ نے حکومت کو اس حد تک اپنی طرف متوجہ کیا کہ اسے اپنی عافیت اور اپنا وجود خطرے میں محسوس ہونے لگا اور مکہ و مدینہ ہاتھ سے جاتا ہوا نظر آنے لگا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے امام ہادیؑ کو جلاوطن کر کے سامرا کے محلہ عسکر میں حکومت کے کارندوں کی نگرانی میں میں سال تک قید کھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اقدام کا سبب عوام میں امام کے اثرات، ان کی مقبولیت، ان کا مجاہدناہ کردار تھا۔

حکومت کو امام ہادیؑ کو اپنی نگرانی میں رکھنا بزعم خود بجا تھا کیونکہ امام کی مقبولیت عوام میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ دار الخلافہ کے بھتیرے مقامات کے لوگ امام ہادیؑ کی روحانیت کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ثبوت کے طور پر ہم اس واقعے کو نقل کرتے ہیں: متولی نے یحیی بن ہرئمہ کو مدینہ سے امام کو سامرا لانے پر مأمور کیا تھا۔ چنانچہ یحیی بن ہرئمہ کہتا ہے کہ

”جب میں بغداد آیا تو والی بغداد اسحاق بن ابراہیم طاہری نے مجھ سے سفارش کی کہ اگر علی بن محمد تقیٰ کی خانہ تلاشی کے موقع پر تمہیں کچھ نظر آیا ہو تو متولی سے نہ کہنا اور سامرا میں بھی متولی کے آدمی وصیف ترکی نے ان کے حق میں سفارش کی، اس بات سے مجھے سخت تجویز ہوا۔“

تاریخی اسناد سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار الخلافہ کے کارندے تک امام کے حامی ہو گئے

تھے۔ انہی مسائل نے حکومت کو امام سے اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ متولی نے بیس برس تک اپنی خصوصی نگرانی میں رکھنے کے بعد زہر دے کر انہیں شہید کر دیا۔

حضرت امام حسن عسکری۔

کی حیات اور ان کے کارہائے نمایاں پر ایک نظر

دو سویں امام حضرت علی نقیؑ کے فرزند ارجمند حضرت امام حسن عسکریؑ کی ولادت با سعادت ۱۰ اور ربیع الثانی ۲۳۲ ھـ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کا اسم مبارک ”حسن“ اور کنیت ”اب محمد“ تھی چونکہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سامراء کے نزدیک ”عسکر“ نامی چھاؤنی میں قیدی کی حیثیت سے بسر ہوا، اس لئے آپ عسکری کے لقب سے مشہور ہوئے۔

امام کی زندگی کے ابتدائی گیارہ سال والد بزرگوار کے ساتھ مدینہ میں گذرے۔ اس کے بعد حکومت نے امام نقیؑ کو مدینہ چھوڑنے پر اور عراق جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ امام حسن عسکریؑ بھی اپنے والد گرامی کے ہمراہ تمام شدائد و مصائب برداشت کرتے ہوئے سامراء پہنچ۔ سامراء میں امام علی نقیؑ جس تہائی کی جگہ اور زندگی میں مقید تھے امام حسن عسکریؑ بھی وہیں آپ کے ساتھ تھے۔ امام نے تمام حقائق، علوم و معارف اپنے پدر عالی قادر سے حاصل کئے۔ ۲۵۳ ھـ میں امام علی نقیؑ کی شہادت کے بعد ۲۲ رابر برس کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ امام علی نقیؑ نے اپنی شہادت سے چھ ماہ قبل اپنے اصحاب و اقرباء کے درمیان آپ کی امامت کا اعلان فرمادیا تھا۔

زمانہ امام کے سیاسی حالات

جب امامؐ نے بار امامت سنپالا، اس وقت عباسی خلیفہ معز باللہ بر سر اقتدار تھا۔ معز کے معزول ہونے کے بعد مہتمدی باللہ نے گیارہ مہینے حکومت کی، پھر وہ بھی معتمد کے ذریعہ ہٹا دیا گیا۔ اگرچہ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب عباسی حکومت سخت داخلی کشکش اور بدحالی کی سختیاں جھیل رہی تھی۔ پھر بھی سرمایہ دارانہ جنگ میں ملوث یہ سارے گروہ حقیقی اسلام اور اس کے سپے رہنماؤں کے خلاف متعدد

تھے۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد حکومت نے انہے مذهب حقہ پر دباؤ، پابندی شدید نگرانی اور غیر معمولی سختیوں کو معمول بنارکھا تھا۔ یہ مگر انی "نظر بندی" اور سختی امام یا زدهم پر کئی گناز یادہ تھی۔ اور یہ اس لئے تھا کہ اس دور میں رسول اللہؐ کی یہ حدیث لوگوں کے زبان زد تھی کہ "گیارہویں امامؑ کا فرزند ظالم حکومت کا خاتمه کر دے گا۔ اور دنیا میں حق و عدالت کا نظام قائم کرے گا۔" یہی وجہ تھی کہ عنان حکومت جس کے ہاتھوں میں بھی ہوتی تھی وہ امام عسکریؑ کو قید خانہ میں رکھتا تھا۔ عباسی حکمران جانتے تھے کہ مسلمانوں کے واقعی رہبر اور پیغمبرؐ کے حقیقی جانشین یہی حضرات انہی ہیں۔ امام حسن عسکریؑ جانشینان برحق کے سلسلے کی گیارہویں کڑی ہیں کہ جن کے بعد ہی مہدی موعودؑ کا عہد شروع ہونا ہے۔ اسی بناء پر یہ لوگ گیارہویں امام کو ایک لمحہ کے لئے بھی آزاد چھوڑنے اور نگرانی میں کی کرنے پر تیار نہیں تھے اور حضرت کو برابر چھاؤنی (عسکر) میں رکھتے تھے۔ صرف جب صاحبان اقتدار تبدیل ہوتے تھے تو اس دوران معمولی سی آزادی (وہ بھی شدید سرکاری نگرانی کے ساتھ) حاصل ہوتی تھی۔ جیسے ہی نیا حاکم حکومت کی باغ ڈوراپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا، حضرت کو دوبارہ قید کر لیا جاتا تھا۔ معتمد کے زمانے میں امام اور ان کے شیعوں پر ظلم و ستم اور نگرانی اپنے شباب پر تھی باوجود ان نامساعد حالات اور مصائب کے امام ہمیشہ فرائض ہدایت و امامت کو انجام دیتے رہے۔ جس وقت امام عسکریؑ قید میں تھے اس وقت امت اور امام کے درمیان رابطہ کے لئے نمائندے معین کئے تھے لیکن ان پر بھی ہر وقت حکومت کے سلامتی ذمہ داروں کی بھرپور نظر رہتی تھی اور کبھی کبھی تو ان امور کی نمائندگی کی انجام دی کے لئے نمائندوں کو سیاسی، سماجی اور مذہبی امور انجام دینے کے لئے طرح طرح کے پوشیدہ انداز اختیار کرنا پڑتے تھے مثلاً جناب عثمان بن سعید اور ان کے فرزند ابو جعفر محمدؑ بن عثمان جو امام کے مخصوص نمائندے تھے انہوں نے بغداد میں دوکان کھولی تاکہ ان سے ملنے والوں پر حکومت شک نہ کرے یہ عرصہ تاریخ میں اختیار کئے گئے شیعہ مجاہدوں اور حکیمانہ تدبیر (Tactics) میں سے ایک مثال ہے۔ اس طرح اموی اور عباسی حکومت کے سخت اور کسک بھرے ماحول میں انہم مخصوصینؓ کے زیر ہدایت پیام حق کے چراغ کو روشن رکھا گیا۔ امام

کے نمائندوں نے جو طرح طرح کے فرائض انجام دیئے ہیں ان میں شیعہ سیاسی انقلاب کی رہبری، رہنمائی، سماجی مسائل، اجتماعی میں رہنمائی، تحصیل خس، اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور امام و امت کے درمیان رابطہ رہا ہے۔

اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں امامؑ کا کردار

امام حسن عسکریؑ نے صرف اٹھائیں برس کی عمر پائی، پھر بھی معارف اسلام کی تبلیغ و ترسیل میں بڑا عظیم الشان نقش چھوڑا ہے۔ ایک طرف تو بڑے بڑے نامور اور ماہر شاگرد تیار کئے اور دوسری طرف جب کہ یونان، ہندوستان اور قدیم ایران کے انحرافی اور انحطاطی افکار و نظریات اسلامی معاشرے میں سرایت کر رہے تھے، امامؑ گذشتہ انہم مخصوصینؓ کی مانند اس انحراف بھرے اور گمراہ کن آراء و عقائد کے مقابلے میں (دیوار بن کر) کھڑے ہو گئے اور فکری و نظریاتی (Ideological) محااذ پر اسلام کی حفاظت فرمائی۔

"احراق کندی" تناقضات قرآن کے سلسلے میں کتاب لکھ رہا تھا۔ امامؑ کو یہ خبر ملی تو آپ مناسب وقت کے انتظار میں رہے۔ ایک دن "کندی" کے کچھ شاگرد امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؐ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ آیات میں کوئی ایسا ہے جو اپنے استاد کو اس بیہودہ فضول کو شش سے باز رکھ سکے؟ اس کے بعد اس سلسلے میں کچھ عمداً اور لطیف نکات بھی ارشاد فرمائے۔ جب "کندی" کے تلامذہ نے وہ نکات استاد کی خدمت میں پیش کئے، تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ فکر کس نے بھری ہے؟ آخر کار ان سب نے اعتراف کیا کہ ہمیں یہ باتیں "ابو محمد" نے سکھائی ہیں۔ پھر "کندی" نے بھی اعتراف کر دیا کہ سوائے خاندان رسالت کے کوئی بھی ان گمراہیوں کو روک نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے قرآن کے خلاف تمام نوٹوں (Notes) اور جسٹروں کو نذر آتش کر دیا جو قرآن پر اعتراف و تقید کے سلسلہ میں لکھے تھے۔ یہ واقعہ امام عالیٰ ہم کے علمی مجاہدوں کا ایک بہترین نمونہ اور اعلیٰ فکری نقش ہے۔

حدیث کے بنیادی مأخذوں میں بہت سی حدیثیں امام حسن عسکریٰ سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے پیغمبر اسلام کی مشہور ترین حدیث کہ ”شرابی، مشرک اور بہت پرست کے مثل ہے۔“ امام حسن عسکریٰ ہی کے ذریعہ روایت کی گئی ہے۔ ابن جوزی نے ”تحریم الخمر“ میں نقل کی ہے کہ ابو نعیم فضل بن وقین نے اس حدیث کو اس لئے صحیح بتایا کہ اہل بیت رسول کے توسط سے آئی ہے۔

سماعانی ”کتاب الابصار“ میں لکھتا ہے کہ حافظ واعظ ابو محمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم طوسی بلاذری نے اس حدیث کو امام ابو محمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی الرضا سے سنا ہے۔

امام کے بعض مشہور تلامذہ:

۱- ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری، جو امام کے نواب اور نمائندوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے چار اماموں کا زمانہ دیکھا ہے۔

۲- داؤد بن ابی زید نیشاپوری۔

۳- ابو طاہر محمد بن علی بن ہلال۔

۴- ابو عباس بن جعفر حمیزی نقی، جو اپنے زمانے کے بزرگ علماء میں سے تھے۔ ان کی اہم تصنیف ”قرب الاسناد“ ہے جو کتاب کافی کا خاص مأخذ ہے۔

۵- محمد بن احمد بن جعفر نقی، آپ بھی امام کے نائیں میں سے تھے۔ جعفر بن سہیل صیقل۔

۶- محمد بن حسن صرفیٰ، آپ اپنے دور کے صفوں کے علماء میں شمار ہوتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے ان میں سے ”بصائر الدرجات“ مشہور ہے۔ ابو جعفر حمیانی برکی۔

۷- ابراہیم بن ابو حضن ابو سحاق کاتب۔

۸- ابراہیم بن مہریار، صاحب ”کتاب البشارات“۔

۱۱- احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن داؤد ہمدانی الکاتب الندیم، ادب و فقہ کے بزرگ استاد تھے۔

۱۲- احمد بن اسحاق الاشعري ابو علی نقی، یہ بھی ممتاز علماء میں سے تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے ایک کتاب ”علل الصوم“ ہے۔

یہ چند نام ان بزرگ علماء کے ہیں جنہوں نے گیارہویں امام کی بارگاہ سے کتب فیض کیا اور علوم اسلامی کی نشر و اشاعت اور عقائد و افکار اسلام کی تعلیم اور مذہبی معاشرے کی فکری رہنمائی کے لئے انہیں کوششیں کی ہیں۔ امام حسن عسکریٰ نے قرآن مجید کی تفسیر کا بھی درس دیا، جس کی بنیاد پر ”ابو علی حسن بن خالد بن محمد بن علی برقی“ نے تفسیر لکھی جو ایک سو میں (۱۲۰) ابواب پر مشتمل تھی۔ افسوس کہ آج یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔ لیکن بہت سی روایتیں جو قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر میں معتبر اسلامی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اسی کتاب سے اقتباس کی ہوئی ہیں۔

”تحف العقول“ میں اسحاق بن اسماعیل الاشعري کے نام امام کا ایک قدرے مفصل رسالہ ہے جس میں امام کے کلمات قصار (اقوال) بھی درج ہیں۔

ان تمام عظیم علمی اور فکری کارناموں کو امام حسن عسکریٰ نے ۲۸ سال کی مختصر مدت میں انجام دیا جس میں صرف ۶ سال امامت کی ذمہ داری سنبھالی ہے (امام علی نقی کی شہادت کے بعد) اور وہ بھی اس خطرناک ماحول میں اور بادشاہان عباسی کے جو روتمن کے دور میں۔

ان علی سرگرمیوں اور فکری رہنمائیوں کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی امام نے کارہائے نمایاں انجام دیئے جو حقیقی اسلام کے استقرار کی راہ میں نقش دام ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امام کو اپنی تیڈ میں رکھتے ہوئے بھی مطلق العنوان حکمران اس قدر خائف تھے کہ امام کی جان کے درپے ہو گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ”حقیقت پاہے زنجیر ہو کر بھی باطل کے وجود کے لئے ایک بڑا تازیانہ ہوتی ہے۔ باطل پرستوں کا یہ اصول ہے کہ وہ حقیقت کے ستارے کو غروب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ایک ستارہ غروب ہوتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا طلوع ہو کر پرستاران شب کو دعوت مبارزہ دیتا ہے اور

ایک شمع سے متعدد شعیں روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح ارباب حق کے گیارہویں عظیم پیشوای امام حسن عسکریؑ میں عبادی خلیفہ معتمد کی سازشوں کے سبب زہر دغا سے شہید ہوئے۔ اور اپنی جگہ باطل شکن اور عدل گستر امام مہدیؑ کو چھوڑ گئے تاکہ دیرینہ سنت کے مطابق حق پرسنوں کی روایت کو زندہ رکھیں اور بالآخر ایک دن باطل کی بساط کو والٹ کر طاغوتی طاقتوں کا خاتمه فرمائیں۔

عدل و انصاف سے بھر دیں۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ عَلِيٍّ وَمُحَمَّدًا۔

امام زمانہؑ

امام زمانہؑ اور عقیدہ مہدویت

۲۶۰ مطابق ۳۸۷ء میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد مشیت خداوندی نے بارہویں امام حضرت مہدیؑ کو پرده غیبت میں روپوش کر دیا تاکہ مشعل بردار نور، ظلت کی بے پناہ طاقتوں کی یورش سے محفوظ رہے۔

غیبت امام کے زمانہ کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: غیبت صغیر جس کی مدت **۲۶۰** مطابق ۳۸۷ء سے **۳۲۹** مطابق ۹۳۰ء تک ہے اور غیبت کبری جو **۳۲۹** مطابق ۹۳۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ غیبت صغیر کے دوران امام اپنے نائب (نواب اربعہ) کے ذریعہ اپنے پیروکاروں سے رابطہ رکھتے تھے مگر اس کے بعد سے یہ ظاہری رابطہ منقطع ہو گیا اور امام کامل طور پر پرده غیبت میں چلے گئے، ایک مناسب مدت تک کے لئے جسے مشیت خداوندی منتخب کرے گی، اس وقت وہ ظہور فرمائیں گے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام مہدیؑ کے ظہور کے ساتھ ہی دنیا میں حکومت عدل و نظام الہی قائم ہو جائے گا اور اسلام کی تحقیقی تعلیمات کامل طور سے راجح ہو جائیں گی۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا کسی کی اتنی طویل عمر بھی ہو سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ائمہ ایسے انسان ہیں جو خداوند عالم کے خصوصی فیض و عنایت کے حامل ہیں۔ وہ انسان بھی ہیں اور خصوصی قوت و اختیارات کے مالک بھی ہیں اور روحانی بلندی کے لحاظ سے معنوی کمال کی چوٹی پر فائز ہیں، اگر خدا نے بزرگ کی خاص عنایت کی وجہ سے ان مقدس ہستیوں میں سے کوئی ہستی عام انسانوں کے برخلاف زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو تو کوئی تجھ بی بات نہیں۔ اگر ہم خداوند تعالیٰ کی ذات، اس کی قدرت اور روحانیت پر اعتقاد رکھیں تو ہمارے لئے اس حقیقت کو سمجھنا زیادہ مشکل

نہیں کہ کوئی انسانِ کامل صدیوں تک موت سے محفوظ رہ سکتا ہے، کیونکہ خداوند قدوس جو موت و زیست کے قانون کا بانی ہے، بلا شک کسی کی حیات کو معمول سے زیادہ (اپنی مشیت کے مطابق) طولانی کر دینے پر بھی قادر ہے۔ کسی مسلمان کے لئے بالخصوص اس امر میں کسی شک یا تردید کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ قرآن کی رو سے ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت خضر آج بھی زندہ ہیں اور حضرت نوحؑ نے میثکڑوں سال کی عمر پائی۔

غیبت کے دور میں امام کون سا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ممکن ہے سوال پیدا ہو کہ امام دو غیبتوں میں کون سا کردار ادا کر رہے ہیں یا کیا ان کی امامت بے کار اور لا حاصل ہے؟ یہ شبہہ امامت کی حقیقت اور اس کے فرائض سے ناواقفیت کی پیداوار ہے۔ جیسا کہ بار بار بتایا گیا ہے کہ امام صرف سیاسی، اجتماعی اور فکری رہبری کے فرائض انجام نہیں دیتا بلکہ اہم معنوی، باطنی اور روحانی فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ امام دنیا والوں کے لئے فیضانِ الہی کا ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ جو لوگ انسانی اور معنوی ارتقاء کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں امام ان روحوں کی رہبری کرتا ہے۔ امام کے فرائض مخفی اجتماعی اور مادی ہی نہیں بلکہ باطنی اور روحانی بھی ہوتے ہیں۔ امام صرف جسم ہی سے نہیں بلکہ روح سے بھی رابطہ رکھتا ہے اور مونوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ امام کے اس ماورائی اور باطنی پہلو کو اگر منظر کھا جائے تو اس کے ذریعہ ہم غیبت کے زمانے میں امام کے کردار کو سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں بھی باطنی رہبری اور ہدایت کی طرف اشارہ موجود ہے اور الیاسؑ و خضرؑ جیسے انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو باطنی طور پر لوگوں کو نیکی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ امام آفاق باطن میں بھی موجود ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے کہ امام دنیا والوں کے لئے عنایت و فیضانِ ربیٰ کا وسیلہ ہے۔ خدا نے انسان کو اپنے فتن تحقیق کے شاہکار کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جس میں بعض ملکوتوں

صفات بھی موجود ہوتے ہیں۔ ”خلق اللہ آدم علی صورتہ“ لیکن خداوند عالم صرف کامل انسانوں جو پیغمبر اور ائمہ ہوتے ہیں، ان میں اپنی عظمت تخلیق کے ہر رخ، ہر پہلو اور ہر خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ائمہ خالق کی عظمت کا مجسم ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک مصور تمام نقش اپنا شاہکار بنانے کے لئے کھینچتا ہے، اسی طرح خالق کائنات نے بھی زمین و آسمان ان ہی مقدس ہستیوں کے لئے خلق کئے ہیں، جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ: ”لولاک لاما خلقت الا فلاک“ یعنی ”اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔“ ایسی صورت میں تمام ائمہ بھی اسی ”حقیقتِ محمدی“ سے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: ”اولنا محمد و او سلطنا محمد و اخرنا محمد۔“ اس رو سے سارے ائمہ حدیث قدسی کے اس جملہ کے مصدق ہیں۔ اس طرح امام کا وجود ہر دو اور ہر زمانہ میں ہستی کی بقا کا سبب اور عنایت و فیض خداوندی کا ذریعہ ہیں۔

امام پر وہ غیبت میں بھی وہ خوشید ہیں کہ جس کے گردز میں، چاند اور ستارے گردش کرتے ہیں، رانستہ یا نادانستہ تمام موجودات امام کی ذات سے نور ہدایت حاصل کرتے ہیں، اسی وجہ سے امام رضاؑ کی مشہور حدیث میں آیا ہے کہ: ”الامام كالشمس الطالعة المجللة بنورها العالم وهو بالافق حيث لا يناله الا بصار ولا الا يدري۔“ یعنی ”امام خوشید رخشان کی طرح ہے جو تمام جہاں کو نور کرتا ہے اور وہ ان آفاق پر جلوہ گر ہوتا ہے جہاں نہ نظر سے پاسکتی ہے، نہ حواسِ خمسہ سے چھو سکتے ہیں۔

فلسفہ غیبت

فلسفہ مہدویت کیا ہے؟ فلسفہ مہدویت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اسلامی نقطہ نظر سے فلسفہ تاریخ اور جہاں بینی کے مسائل سے آشنا ہوں۔ تاریخ کی ترقی پذیری اور دنیا میں انسانی زندگی کی آزمائشی کیفیت اور انسان کے انتخاب اور آزاد ارادہ کے مالک ہونے کے متعلق

اسلامی عکشہ نظر کی روشنی میں ہم انبیاء کی بعثت، حضرت محمد مصطفیٰ کی بعثت اور ختم نبوت کا فلسفہ اور بارہ اماموں کے مقرر ہونے کی حکمت اور حضرت مہدیٰ کی غیبت اور دوبارہ ظہور کے فلسفہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے خدا نے انسان کو ایسے موجود کے طور پر بنایا ہے جو اشرف الخلوفات ہے اور ”ارادہ“، ”تعقل“، ”ایمان“ اور ”اشراق“، یعنی الہام کی خصوصیتوں کا مالک ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ”ارادہ“ کی آزادی اور انتخاب کی توانائی سے نواز ہے، جو ایک طرف تو خدا کی عظیم عنایت ہیں مگر دوسری طرف ایسی بڑی ذمہ داری وی جسے قبول کرنے سے پہاڑوں، زمین اور آسمان نے انکار کر دیا تھا۔ اگر ارادہ کی آزادی اور انتخاب کی توانائی نہ ہو تو انسان جانور اور چوپاںیوں سے بھی نیچے گر جائے۔

مگر انتخاب اس وقت کارآمد ہوتا ہے جب راہ راست واضح ہوتی ہے۔ خداوند عالم کی عنایت اس کے وجود کا لازم ہے۔ اس نے ”نبوت“ کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کے لئے نیز انسان کی سعادت اور نجات کے ذرائع فراہم کرنے کے لئے ہی قائم کیا۔ انسان کی روحانی اور فکری نشوونما کے لئے یکے بعد دیگرے پیغمبر مبعوث ہوئے اور مختلف رخوں سے حقیقت کی رونمائی کی، یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کی بعثت اور نزول قرآن کے ساتھ ہی بندوں تک ”حقیقت“ اور ”پیغام“ مکمل طور پر پہنچ گئے، دین کی تکمیل ہو گئی، اس کے حدود اور اصلی خطوط متعین ہو گئے۔ چونکہ ”پیغام“ پہنچانے کا کام مکمل ہو چکا تھا لہذا حضرت محمدؐ کے ساتھ ہی بعثت انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور حضرت خاتم الانبیاء کی رسالت ہر زمانے کے لئے لازمی طور پر قابل اتباع ہو گئی اور اس کے بعد سے قیامت تک تمام انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبر اسلام کی پیروی کریں۔

اس کے بعد شرح تفسیر اور اجراؤ فہاذ کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ قرآن میں ”پیغام“ کیجا پہنچ گیا مگر عام انسانوں کے لئے کلام اللہ کے رموز کا عرفان ممکن نہ تھا لہذا ضرورت تھی ایسے خدائی افراد اور کامل انسانوں کی جو ایک طرف تو حدیثوں کے ذریعہ پیغام قرآنی کے تمام گوشوں اور بارکیوں کی تفسیر و تشریح اور سیرت پیغمبرؐ کی تفصیل پیش کریں دوسری طرف عملی طور پر درس دیں کہ

مختلف حالات میں انسان کس طرح کی وضع رکھے۔ دوسرے معنوں میں قرآن کے ساتھ ساتھ ایسے انسانوں کی ضرورت تھی جو انسانیت کے لئے ”اسوہ جاوید“ اور عملی نمونہ ہوں۔ اسی وجہ سے خدا نے ”امامت“ کا سلسلہ قائم کیا۔

لیکن انسانوں کی تربیت (نبوت عامہ) اور خدائی ”پیغام“ پورے طور پر پہنچ جانے کے بعد (نبوت خاصہ) جب معلمان الہیہ اور رہبروں نے اس کی تشریح کر دی (منصب امامت) تو مشیت خداوندی کا رُخ اس طرف ہوا کہ ایک امام کو پرده غیبت میں روپیش کر دے تاکہ پیغمبروں اور سابقہ اماموں کی تعلیمات کی روشنی میں اور اپنی عقل کی مدد اور فکری توانائی کے ذریعہ اپنے اجتہاد کو صحیح طور پر پورا کریں۔ غیبت کے بعد کا دور ”اجتہاد“ کا دور ہے۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے علم اور اپنی عقل کا صحیح استعمال کریں تاکہ وحی اور سیرت پیغمبر و ائمہ کی ہدایت سے اپنے مسائل کے حل کے سلسلہ میں فائدہ حاصل کریں۔ بالآخر مشیت الہی دوبارہ امام کو پرده غیبت سے ظاہر کرے گی تاکہ دنیا میں آئیڈی معاشرہ اور مثالی نظام قائم کم ہو۔ انسان دو رغبات میں ایک امتحانی اور آزمائشی مرحلہ سے دوچار ہے، اس کے بعد خدائی معلم دوبارہ ظاہر ہو گا اور صحیح کو غلط سے اور حق کو باطل سے الگ کر دے گا۔

ہم اس ہدایت کے پورے خدائی انتظام کو ایک اسکول سے شبیہ ہے سکتے ہیں، گویا پہلے مختلف درجوں کی سلسلہ وار تعلیم کامل کرائی گئی (بعثت انبیاء) اور تحریری رہنمائی پیشی گئی (وحی) آخری (Final) درجہ کی نظریاتی تعلیم دی گئی (پیغمبر اسلام کی بعثت) پھر گیارہ اماموں نے اس تعلیم کو عملی طور پر برقرار کر دھایا۔ (امامت کا دور)۔ اس کے بعد معلم کو غیبت کے پردے میں چھپا لیا گیا اور طالب علموں کو چھوڑ دیا گیا کہ (عقل و خرو اور استعداد کے بل بوتے پر) امتحان دیں (غیبت کا زمانہ)۔ اس کے بعد معلم دوبارہ ظاہر ہوں گے اور صحیح جوابات عملی طور پر چیک کر کے نمبر دیں گے (ظہور)۔ اس مثال کے ذریعہ ہم غیبت کے فلسفہ کو کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

تاریخ ترجمہ اسوہ ہائے جاویدہ

(نگاشتہ پروفیسر ڈاکٹر مولا ناسید علی محمد نقوی صاحب دام فیضہ)

ازادی بیہ فاضلہ سیدہ بنت زہرانقویہ ندی آله‌نديزاد تو نیچا تھا

دیکھئے ذہن و عمل کی عصمتیں

چودہ معصوموں کی زندہ سیرتیں

دیکھئے کردار کی اوپرائیاں دیکھئے انسانیت کی رفتیں

یہ جلالت کے نمونے، اوج بخش یہ فروغ بندگی کی شوکتیں

زندہ و تابندہ جلوہ زار ہیں فخر انساں کے لئے یہ دوستیں

قابل تقلید ہیں یہ سیرتیں جاذب قلب و نظر یہ صورتیں

ہے قلم بھی ان کے آگے سجدہ ریز

ان سے ہیں تحریر میں سب قیمتیں

چھپ چکی ہے اسوہ ہائے جاویدہ ایک فضل کی یہ فکری جو دتیں

وہ علیٰ کا اور محمدؐ کا سی

ہیں جلی اس کے قلم کی عزتیں

وہ مصنف، وہ محقق، ذی ذکا

گھیرے ہیں اس کو بہت سی شہرتیں

فارسی تالیف کو اردو میں بھی

دیکھیں اردو ترجمہ بھی اہل ذوق

یہ ندی آله‌ندي کی قلمی ہیئتیں

بنت زہرا وہ ادیبہ پاکزاد بڑھتی جائیں اس کی فکری طاقتیں

وقت بھی تائید میں کہتا ہے یہ

لیجئے زندہ مثالی سیرتیں

۳۶۴